”حاصل گھاٹ“ میں پاکستانی اور امریکی معاشرے کی ثقافتی شناختیں (تجزیاتی مطالعہ)

مقالہ برائے ایم۔ فل (اردو)

مقالہ نگار:

آفرینش گلناز

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اگست، ۲۰۲۰ء

”حاصل گھاٹ“میں پاکستانی اور امریکی معاشرے کی ثقافتی شناختیں (تجزیاتی مطالعہ)

مقالہ نگار:

آفرینش گلناز

یہ مقالہ

ایم۔فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لئے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگو یجز

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد

اگست، ۲۰۲۰ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگو ئجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: "حاصل گھاٹ" میں پاکستانی اور امریکی معاشرے کی ثقافتی شناختیں (تجزیاتی مطالعہ)

پیش کار: آفرینش گلناز رجسٹریشن نمبر: 1380-MPhil/Urd/F-17

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبۂ اردو زبان و ادب

ڈاکٹر شفیق انجم: ---------------

نگران مقالہ

ڈاکٹر ظفر احمد: ---------------

شریک نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر شاہد صدیقی: ---------------

ڈین فیکلٹی آف لینگو ئجز

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان : ---------------

پرو ریکٹر اکیڈمکس

تاریخ: -------------

اقرار نامہ

میں، آفرینش گلناز حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد کے ایم۔فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر شفیق انجم اور ڈاکٹر ظفر احمد کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لئے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گی۔

آفرینش گلناز

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد

اگست، ۲۰۲۰ء

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر

باب دوم: 'حاصل گھاٹ' میں پاکستانی اور امریکی ثقافت کی سماجی شناختیں

بابِ سوم: 'حاصل گھاٹ' میں پاکستانی اور امریکی ثقافت کی سیاسی شناختیں

بابِ چہارم: 'حاصل گھاٹ' میں پاکستانی اور امریکی ثقافت کی علمی شناختیں

Abstract

Bano Qudsia is a prominent Pakistani playwright, novelist and short story writer. In her literary life, that spanned over four decades, she has explored multiple social, psychological, spiritual and cultural issues. "Hasil Ghat", a novel published by her in 2003, depicts her deep understanding of the diverse cultural issues of the East and the West. Narrated through the main character "Humayun Fareed" this novel tells the story of a Pakistani emigrant in America who, after coming back to Pakistan, compares the social and cultural lives of the two societies. Through this novel Bano Qudsia has highlighted the cultural contrasts and diversities of a new and an old world.

Though Bano Qudsia's has used multiple platforms to show her literary genius but this thesis entitled as ***"A critical analysis of Pakistani and American cultural identities as depicted in novel 'Hasil Ghat"*** has explored only her novels for background study. While analyzing "Hasil Ghat" this research work has focused mainly on the divergent cultural identities of Pakistani and American way of livings and not on the thematic, artistic or stylistic study of the novel as general. Using primary as well as secondary sources this study delves deep into the cultural and civilizational contrasts of the two intrinsically different worlds and comes up with some thought provoking social and cultural lessons. Cultural and civilizational study of American and Pakistani societies through the enticing prism of fiction is a distinctive feature of Bano Qudsia and by studying "Hasil Ghat" this work explores this distinctiveness of the writer. This study, in general, has studied the fictional perspective of a conservative Pakistani society and a modern American world.

اظہار تشکر

تشکر کے سلسلے کہاں سے شروع کروں اور کہاں پر ختم۔ یقیناً انسان خدا کی مدد کے بغیر انتہائی بے بس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مقالے کی تکمیل کے بعد احساسِ تشکر کی وصولی کا سب سے پہلا حق رب تعالیٰ کا ہے۔ جس کی خاص مہربانی اور کرم سے ہی میں آج اپنے مقالے کو کامیابی سے پایہ تکمیل تم پہنچا سکی ہوں۔ پھر اس کے بعد اپنے والدین کی بے حد احسان مند ہوں جنہوں نے مجھے نہ صرف ایم۔ فل کرنے کی اجازت دی بلکہ روز گار و معاش جیسی مشکل ترین سرگرمیوں سے مکمل طور پر بری الذمہ رکھا۔

بلاشبہ تحقیقی مقالہ لکھنا انتہائی مہارت طلب کام ہے۔ میں نے اپنی طرف سے حتیٰ الامکان کوشش کی ہے کہ اپنے عنوان پر اچھے سے اچھا کام کر سکوں۔ اس سلسلے میں، میں صدر شعبہ اردو نمل، ڈاکٹر عابد سیال صاحب سمیت اپنے تمام اساتذہ کرام کی احسان مند ہوں جنہوں نے مجھے آج اس مقام تک پہنچایا۔ علاوہ ازیں میں اپنے نگران ڈاکٹر شفیق انجم اور ڈاکٹر ظفر احمد کی بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جن کا دستِ شفقت ہر لمحہ میرے ساتھ رہا اور ہر قدم پر میری راہنمائی کی۔

میں حلیم احمد سمیت اپنے تمام کلاس فیلوز فریحہ اکرام، عاقب جاوید، شاہد اقبال اور تمام دیگر احباب کی بھی شکر گزار ہوں جن کی بے پناہ ہمدردی اور راہنمائی نے میرا حوصلہ بلند کیا۔ میں دعا گو ہوں کہ اللہ پاک ان سب کو زندگی کے ہر موڑ پر پر خوش و خرم رکھے اور کامیاب کرئے۔ آمین

آفرینش گلناز

سکالر ایم۔فل اردو

باب اول

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف: تمہید

i. موضوع کا تعارف

میرے ایم فل کے مقالے کا موضوع ”حاصل گھاٹ میں پاکستانی اور امریکی معاشرے کی ثقافتی شناختیں (تجزیاتی مطالعہ) “ ہے۔

بانو قدسیہ پاکستان کی ایک اہم ناول نگار، افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار ہیں۔ ناول نگاری کے حوالے سے ان کی شناخت کا ایک اہم حوالہ 'راجہ گدھ' ہے جو ۱۹۸۱ء میں منظر عام پر آیا۔ بانو قدسیہ نے اس کے بعد متعدد ناول اور ناولٹ لکھے جن میں 'حاصل گھاٹ'، 'شہر لازوال، آباد ویرانے' شامل ہیں۔ ان کے ناولٹوں کا مجموعہ 'چہار چمن' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ 'حاصل گھاٹ' ان کی ناول نگاری کا ایک خصوصی حوالہ ہے جو، ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا۔ 'راجہ گدھ' کے بعد یہ ناول ان کے فکری محور کے زیادہ قریب تر ہے بلکہ بعض صورتوں میں اس کی حیثیت 'راجہ گدھ' کے مقابلے میں کہیں آگے ہیں۔ خاص طور پر زندگی کے حاصلات کے بارے میں اس ناول میں بانو قدسیہ نے خوب دل لگا کر لکھا ہے۔ آخری عمر کی تخلیق ہونے کے باعث اس ناول میں بانو قدسیہ نے اپنے علم و تجربے کو پورے طور پر سمونے کی کوشش کی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار پاکستان سے امریکہ جاتا اور کچھ عرصہ قیام کے بعد واپس آتا ہے۔ امریکہ میں گزارے دنوں میں اس کی خود کلامی ہی ناول کا پلاٹ ہے۔ امریکی معاشرت کو جس طرح وہ دیکھتا اور اس کا اپنی معاشرت سے تقابل کرتا ہے اس سے مشرق و مغرب کے تصور زندگی کے بہت سے گوشے بے نقاب ہوتے ہیں۔ اور ہر دو ثقافتوں کے مابین فرق واضح ہوتا ہے۔ زیر نظر تحقیق میں اسی فرق و امتیاز کا تفصیلی تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ii. بیان مسئلہ

مشرقی تصور زندگی اور مشرقی ثقافتی اقدار بانو قدسیہ کا محبوب موضوع رہا ہے۔ انھوں نے کم و بیش اپنی سبھی تحریروں میں انسان دوستی، محبت و مروت اور خاندانی تعلق و یگانگت کے مشرقی رویوں کو بہ تکرار

ابھارا ہے۔ مشرق کی صوفیانہ روایت سے بھی وہ شدت سے متاثر رہی ہیں۔ اس کے ساتھ مشرقی فلسفے اور حکمت و دانش سے ان کی رغبت بھی نمایاں ہے۔ ان کے ناولوں میں ان موضوعات پر طول طویل بحثیں ملتی ہیں۔ اور بسا اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کردار کے قالب میں خود اتر کر اپنی باتیں کرانے لگتی ہیں۔ ناول 'حاصل گھاٹ' میں بھی یہی صورت ملتی ہے۔ ناول کے مرکزی کردار کی زبان سے انھوں نے وہ سب باتیں کہلوا لیں ہیں جو وہ خود کرنا چاہتی تھیں۔ امریکہ کی ترقی یافتہ ثقافت کی انھوں نے بجا طور پر دل کھول کر تعریف کی ہے لیکن جہاں بات تقابلی اقدار اور زندگی کے حاصلات کے بارے میں آگے بڑھتی ہے، بانو قدسیہ نے اپنی جانبداری کو درمیان میں شامل کیا ہے۔ تاہم اپنی ثقافت کے بھدے پہلوؤں کو بھی انھوں نے چھپایا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ناول کی کہانی جدید و قدیم طرز زندگی کی کشمکش سے عبارت نظر آتی ہے۔ اس ضمن میں بہت سے ایسے پہلو ہیں جو اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ تحقیق طلب ہیں۔ سیاسی، سماجی اور علمی حوالوں سے مقامی اور امریکی ثقافتوں کے امتیازات کو بانو قدسیہ کی اس کہانی کے تناظر میں جاننا نسل نو کے لئے اہم ہوگا۔ کیا ہے؟ اور کیا ہونا چاہیے؟ سے متعلق بہت سے سوالوں کے جواب اس ثقافتی فرق و امتیاز کو جاننے اور تنقیدی نظر سے دیکھنے سے ہم پہنچ سکتے ہیں۔ اس مقالے میں 'حاصل گھاٹ' کی کہانی کا اسی تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔

iii. مقاصدِ تحقیق

اس تحقیق کے مقاصد درج ذیل ہیں:

ا۔ ناول 'حاصل گھاٹ' میں امریکی اور پاکستانی ثقافت کے بنیادی اندراجات کو تلاش کرنا اور سماجی، سیاسی اور علمی تناظر میں انھیں زیر بحث لانا۔

۲۔ بانو قدسیہ کے ثقافتی نقطہ نظر کو کہانی کے تناظر میں سمجھنا اور تجزیہ کرنا۔

iv. تحقیقی سوالات

مجوزہ تحقیقی موضوع "حاصل گھاٹ میں پاکستانی اور امریکی معاشرے کی ثقافتی شناختیں (تجزیاتی مطالعہ)" پر کام کرتے وقت درج ذیل سوالات مد نظر رکھتے ہوئے ان کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ا۔ ناول "حاصل گھاٹ" کی کہانی کیا ہے؟ اور اس کے ثقافتی تناظرات کیا ہیں؟

۲۔ناول میں امریکی اور پاکستانی ثقافتوں کی پیشکش اور تقابل میں جانبداری اور تعصب کی نوعیت کیا ہے؟
۳۔ حاصل گھاٹ میں ہر دو ثقافتوں کے بنیادی امتیازات اوراختلافات کس معنوی تناظر کے حامل ہیں؟

v. نظری دائرہ کار

موضوع پاکستانی اور امریکی معاشرے کی ثقافتی شناختیں کے پیش نظر بانو قدسیہ کے ناول ''حاصل گھاٹ'' کو زیر بحث لا کر پاکستانی اور امریکی ثقافتوں کے حوالے سے پیش کئے گئے مواد کا تجزیہ و تقابل کرنا، نیز ان شناختوں کے پس پردہ ناول نگار کے نقطہ نظر کو جاننے کی کوشش کرنا تھا۔مقالے کو اسی نہج پر مکمل کیا گیا ہے۔

vi. تحقیقی طریقہ کار

زیر نظر موضوع کے لئے بانو قدسیہ کے ناول ''حاصل گھاٹ''کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ دستاویزی اور بنیادی ماخذات کے ساتھ ساتھ ثانوی ماخذات سے بھی استفادہ کیا گیاہے۔ دوران تحقیق مختلف سرکاری و نجی کتب خانوں سے ہر ممکن فیض حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مختلف جامعات میں اردو ناول، بانو قدسیہ کی حیات و ناول نگاری اور پاکستانی معاشرت و ثقافت کے تحت تکمیل شدہ تحقیقی مقالات نیز ان موضوعات پر تحقیقی و تنقیدی رسائل و جرائد میں شامل مضامین کو بھی دیکھا گیا ہے۔

vii. مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق

مجوزہ موضوع ''حاصل گھاٹ میں پاکستانی اور امریکی معاشرے کی ثقافتی شناختیں (تجزیاتی مطالعہ)'' پر ایم فل / پی ایچ ڈی کی سطح کا کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا۔ تاہم بانو قدسیہ پر پی ایچ ڈی کی سطح کا ایک مقالہ ''بانو قدسیہ:احوال و آثار'' لکھا گیا ہے جس میں ''حاصل گھاٹ'' کے تعارف پر پانچ صفحات شامل ہیں۔

viii. تحدید

بانو قدسیہ کی ادبی جہات متنوع ہیں۔ اس مقالے میں صرف ان کی ناول نگاری کو پس منظری مطالعے کے طور پر زیر بحث لایا گیا ہے۔ مقالے میں 'حاصل گھاٹ' کی کہانی کا خصوصی مطالعہ پاکستانی اور امریکی ثقافتی تناظر میں کیا گیا ہے۔ ناول کا عمومی فنی، فکری و اسلوبی مطالعہ بحث میں شامل نہیں۔ تاہم موضوع کی مناسبت سے کچھ فنی و اسلوبی مباحث کو ضمناً ملحوظ رکھا گیا ہے۔

ix. پس منظری مطالعہ

پس منظری مطالعے کے طور پر زیر نظر تحقیقی موضوع سے متعلق ہر بنیادی و ثانوی کتاب سے استفادہ کیا گیا ہے۔اس حوالے سے "پاکستانی کلچر" از ڈاکٹر جمیل جالبی، "اردو ناول کا ثقافتی مطالعہ" از محمد نعیم ورک، "اردو ناول میں مسلم ثقافت" از ڈاکٹر فاروق عثمان، "پاکستانی ثقافت" از ڈاکٹر رشید امجد، وغیرہ جیسی کتب، جن میں اردو ناول کا پاکستانی سماج کے مختلف زاویوں کے تحت مطالعہ کیا گیا ہو ان پر نظر ڈالی گئی ہے۔ پاکستانی و امریکی ثقافت کے مظاہر کی تفہیم کے لئے اس موضوع پر دستیاب مواد بھی زیر مطالعہ رہا ہے۔ اس طور درست اور ٹھوس تحقیقی نتائج اخذ کرنے میں مدد ملی ہے۔

x. تحقیق کی اہمیت

بانو قدسیہ کا نام جدید اردو ناول اور ناولٹ نگاری میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ناول میں چونکہ تہذیبی عناصر کی فراوانی ملتی ہے اور تہذیب کے ہر زاویے کا احاطہ کرنے کی کوشش نظر آتی ہے،بانو قدسیہ کا ناول بھی قیام پاکستان سے پہلے اور بعد کے سماجی و تہذیبی حالات کے تناظر میں لکھے گئے ہیں۔اس حوالے سے ناول "حاصل گھاٹ" میں بڑی تہذیبوں مشرق و مغرب کے درمیان فرق کو واضح کیا گیا ہے۔لہذا تہذیبی حوالے سے بانو قدسیہ پر کام نہایت اہمیت کا حامل ٹھہرتا ہے اور اس پر کام کرنے کی ضرورت تھی جس کے تحت میں نے یہ موضوع چنا اور اس پر کام کیا۔

ب۔ ثقافتی شناختیں: تعارف و مباحث

i. ثقافت کے معانی و مفاہیم

کسی قوم کی شناخت اُس کی ثقافت سے کی جاتی ہے۔ کسی قوم کے افراد جب مدتوں سے ایک سر زمین پر مل جُل کر رہ رہے ہوں تو اُن کے ہاں مشترکہ قدریں، رسم و رواج، اندازِ زندگی، عائلی قوانین، تفریحات، کھیل، فنون اور مجلسی زندگی کے اصول دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہی خصوصیات اُس قوم کو دوسری اقوام سے مختلف اور ممتاز بناتی ہیں۔ اس قوم کے افراد اپنی ان خصوصیات سے لگاؤ رکھتے ہیں۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں میں وہ اپنی پسند کے مطابق رویوں کو مستحکم کرتے ہیں اور فنونِ لطیفہ یعنی شاعری، مصوری، فنِ تعمیر، موسیقی، خطاطی اور زبان کو پروان چڑھاتے ہیں۔ پھر وہ بتدریج اپنے رہن سہن، رسومات اور لباس وغیرہ کو ارادی طور پر اپنی زندگی کا حصہ بنالیتے ہیں۔ اور یہ تمام عناصر مجموعی طور پر ایک ثقافت کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ تہذیب و ثقافت کی صورت ان ہی عناصر پر بنیاد رکھتے ہوئے ابھرتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ دنیا کی مختلف قومیں بڑی حد تک اپنی اپنی جداگانہ ثقافتی خصوصیات رکھتی ہیں۔ نیز کوئی قوم جتنی پرانی تاریخ کی حامل ہوتی ہے، اُس کی ثقافت اتنی ہی مضبوط اور ہمہ گیر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لسان العرب کے حوالے سے اپنی کتاب "پاکستانی کلچر" میں ثقافت کے معنی و مفہوم کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "لسان العرب' میں ثقافت کے معنی یہ بتائے گئے ہیں کہ علوم و فنون و ادبیات پر قدرت و مہارت کسی چیز کو تیزی سے سمجھ لینا اور اس میں مہارت حاصل کرنا، سیدھا کرنا۔ گویا یہ لفظ ان چیزوں سے تعلق رکھتا ہے جن کا تعلق ہمارے 'ذہن' سے ہے۔"(۱)

کسی بھی معاشرے کے افراد کے طرزِ زندگی یا راہِ عمل میں جو اقدار، رسم و رواج اور معمولات شامل ہوتے ہیں ثقافت کہلاتے ہیں۔ اس میں وہ تمام خصوصیات (اچھائیاں اور برائیاں) شامل ہوتی ہیں جو کہ کسی قوم کی پہچان ہوتی ہیں۔ کیونکہ ثقافت کا مسلسل ارتقاء ہوتا رہتا ہے۔ اس میں تبدیلیاں رونما ہوتے رہنا فطری امر ہے۔ ایک علاقے یا قوم کی ثقافت پر دوسرے علاقوں اور قوموں کی ثقافت کا اثر بھی نمایاں طور پر پڑتا ہے۔ ثقافت چونکہ ایک وسیع مفہوم رکھنے والی اصطلاح ہے۔ اس لئے ثقافت کے لغوی معنی کسی شے یا ذات کی ذہنی و جسمانی نشو نما اور اصلاح کے ہیں۔ "گویا لفظ ثقافت کا مفہوم ذہنی و فکری صلاحتوں پر محیط ہے۔" (۲)

کسی علاقے کے لوگوں کا رہن سہن، طور طریقے، سوچ بچار کا انداز اس علاقے کی ثقافت کہلاتی ہے۔ کیونکہ یہ وقت کے ساتھ ساتھ اس معاشرے کی ضرورت کے مطابق بنتی چلی جاتی ہے ۔ اس طرح اس معاشرے کی سرگرمیوں اور ان کے عنوانات و اظہار، نشان (Symbols) اس ثقافت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا نمونہ (Pattern) ہوتا ہے جس سے اس معاشرے کے مخصوص خدوخال، بشمول، لباس، رسم و رواج اور عقائد و قوانین وضوابط تک ہر شے واضح اور دنیا کے دیگر معاشروں سے الگ اور منفرد نظر آتی ہے۔ اس سب کے ساتھ ثقافت میں اس علاقے کا جغرافیائی پسِ منظر، آب وہوا اور تاریخی واقعات بھی شامل ہوتے ہیں۔ اور اس سے معاشرے کے طرزِ فکر کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ نظیر صدیقی ثقافت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ثقافت سے مراد پورا طریقہ زندگی ہے۔ یعنی ثقافت اس کل کا نام ہے جس میں مذہب اور عقائد، علوم اور اخلاقیات، معاملات اور معاشرت، فنون وہنر اور رسوم ورواج سبھی شامل ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ثقافت کسی قوم کے ان تمام اصول واقدار، عقائد وضوابط اور اعمال واطوار کے مجموعے کا نام ہے جس سے کسی قوم کی امتیازی خصوصیات عبارت ہوتی ہیں۔''(۳)

گویا ثقافت ایک ایسا ضابطہ حیات ہے جو انسانی زندگی کی تمام سرگرمیوں اور افعال میں توازن، ترتیب، ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کرتی ہے۔ اس میں زندگی گزارنے کے ایسے طور طریقے شامل ہوتے ہیں جو کسی معاشرے کے دیگر طریق پر فوقیت رکھتے ہیں ۔ اور عملی زندگی میں انہیں ترجیح دی جاتی ہے ۔ جس سے معاشرے کے ارکان کو پتہ چلتا ہے کہ کیا اچھا ہے اور کیا بُرا، کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ فرد کسی قوم کی ثقافت کی بنیادی اکائی ہے۔ افراد مل کر اپنے مقاصد، قدروں اور اصولوں کا تعین کرتے ہیں۔ یوں ایک وسیع علاقے یا ایک بڑی قوم میں چھوٹی چھوٹی علاقائی ثقافتیں بھی موجود ہوتی ہیں جو مل کر ایک بڑی اور مرکزی ثقافت کو ترتیب دینے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

ثقافت ایک اکتسابی عمل ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ثقافت ایسے رویوں اور کرداروں پر مشتمل ہوتی ہے جو انسان نے معاشرے میں رہ کر سیکھے ہوں۔ مثلاً صبح اٹھ کر ہاتھ منہ دھونا، سلام کرنا، کار چلانا وغیرہ یہ سب معاشرتی آداب اور رسوم ورواج انسان معاشرے میں رہ کر سیکھتا ہے۔ لہذا ان کو ثقافت کہا جاتا ہے۔ اس

کے برعکس ایسے تمام رویے جو فطری طور پر انسان میں پائے جاتے ہیں ثقافت نہیں کہلا سکتے ۔ مثلاً ہم سب کو بھوک لگتی ہے اور نیند کی ضرورت محسوس ہوتی ہے وغیرہ، یہ سب چیزیں حیاتیاتی عمل کے ذریعے ماں باپ سے ہمیں منتقل ہوتی ہیں۔ لہذا ثقافتی رویہ نہیں کہلاتی۔ لیکن ہم کونسی چیز کھاتے ہیں یا پیتے ہیں، اس کا انحصار ثقافت میں رہ کر سیکھنے پر ہوتا ہے ۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ثقافت انسان کی پیدا کردہ چیز ہے جسے وہ نسل در نسل سیکھتا ہے۔ اور ثقافت ہی کی وجہ سے نہ صرف معاشرتی زندگی قائم رہتی ہے بلکہ انسانی معاشرہ بھی ترقی کرتا ہے۔ ہیری شپیرو نے اس بارے میں لکھا ہے:

> ”ثقافت اکتسابی طرز عمل کا نام ہے ۔ اکتسابی طرزِ عمل میں ہماری وہ تمام عادات، افعال، خیالات اور اقدار شامل ہیں جنہیں ہم ایک منظم معاشرے یا گروہ یا خاندان کے رکن کی حیثیت سے عزیز رکھتے ہیں یا ان پر عمل کرتے ہیں یا ان پر عمل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔“(۴)

دراصل ثقافت انسان کے کرداری نمونوں کا ایک ایسا مربوط نظام ہے جو انسان نے معاشرے میں رہ کر سیکھا ہو۔ کیونکہ یہ ایک تخلیقی قوت کا نام ہے۔ جو کسی معاشرے کے افراد کے اندر بہت گہری رچ بس چکی ہوتی ہے۔ اس میں مادی اور غیر مادی ہر قسم کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ یعنی اس میں موٹر کار، ریڈیو، عمارات اور ان کے استعمال کے طریقے اور رسم ورواج، اخلاق، آداب مجلس سے لے کر پیدائش سے موت تک کی رسومات وطریقے شامل ہیں۔ گویا ثقافت کا ماخذ نہ صرف انسان بلکہ اس کے ارد گرد کے طبعی، جغرافیائی، معاشی عوامل اور ایسے دیگر لامحدود تجربات ہیں جن کی روشنی میں وہ اپنی زندگی کے لئے قوائد وضوابط اور نظامِ زندگی مرتب کرتا ہے۔ یوں ثقافت افرادِ معاشرہ کی زندگی اور ان کے رویوں کے اندر گھل مل کر ان کی زندگی کا حصہ بن جاتی ہے۔ بقول ڈاکٹر نصیر احمد ناصر ” ثقافت کل حیاتِ انسانی پر محیط ہوتی ہے۔“(۵)

نیز ان تمام تعریفوں کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں ثقافت محض رقص و سرور، موسیقی، مجسمہ سازی، خطاطی، فنونِ لطیفہ اور انسان کی ذہنی اور جسمانی اہلیتیوں کے اظہار تک ہی محدود نہیں بلکہ تمام انسانی زندگی پر محیط ہے۔ اس میں معاشرت سے لے کر رہن سہن، طرزِ زندگی، رسم ورواج اور روایات تک سبھی معاملات شامل ہیں۔ یہ خود ایک مجموعے کا نام ہے۔ لہذا ثقافت ایک کُل ہوتی ہے جو کسی علاقے میں رہنے والے انسان کے ارادی و غیر ارادی افعال کی بدولت پروان چڑھتی ہے۔ اور یوں ان کُل عقائد، رسم ورواج، علوم وفنون،

قوانین اور معاشرتی رویے اس میں شامل ہوتے جاتے ہیں۔ البتہ اس کے مختلف اجزاء کے تجزیاتی مطالعے اسے مادی اور غیر مادی عوامل میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان دونوں کے مسلسل ظہور پذیر ہونے سے مختلف تبدیلیاں واقع پذیر ہوتی ہیں۔

اگر دیکھا جائے تو ثقافت کے ساتھ ساتھ اس کے ہم معنی چند مزید اور الفاظ بھی مستعمل ہیں۔ جن میں تہذیب، تمدن اور کلچر زیادہ اہم ہے۔ یہ سب الفاظ مختلف مواقع پر، مختلف کتب میں، مختلف محققین نے مختلف انداز میں استعمال کئے ہیں۔ ان الفاظ کے ظاہری فرق کو چھوڑ کر معنی میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ بلاشبہ تہذیب زیادہ قدامت رکھتا ہے۔ جبکہ ثقافت اردو میں نیاوارد شدہ لفظ ہے۔ اور اسی طرح کلچر کا لفظ مغرب سے مستعار لیا گیا ہے۔ جو بحیثیتِ مجموعی تہذیب اور ثقافت دونوں کا احاطہ کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اپنی کتاب ''کلچر کا مسئلہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''کلچر کا مقبول ترین اردو (عربی) ترجمہ ثقافت ہے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی، اس کے لئے لفظ تہذیب اور بے خیالی میں تمدن کا لفظ بھی استعمال ہو جاتا ہے۔''(۶)

مندرجہ بالا الفاظ سننے، پڑھنے، اور لکھنے میں تو ایک جیسے ہی ہیں۔ لیکن اشتراکات کے علاوہ ان میں بعض چیزیں منفرد حیثیت کی بھی ہوتی ہیں۔ تمدن کا لفظ مدن سے نکلا ہے جس کے معنی شہریت اختیار کرنا یا شہر بسانا اور معاشرے میں رہنے کے ہیں۔(۷) گویا ثقافت میں انسان کے ذہنی، فکری، معاشی، معاشرتی، مذہبی، سیاسی وغیرہ سے متعلق ہر طرح کے افکار شامل کر لئے جاتے ہیں۔ جبکہ لفظ ''کلچر'' جرمن زبان کے لفظ ''کلٹور'' سے ماخوذ ہے جس کا مطلب کاشت کرنا ہے۔(۸) یعنی کلچر کا زیادہ تر تعلق بنانے، سنوارنے، ٹھیک ٹھاک کرنے، ترتیب لگانے سے ہے۔ اسی طرح تہذیب کا لفظ کلچر اور ثقافت کے ذریعے ظہور پذیر پانے والے مادی عوامل کا نام ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا ''تہذیب کلچر کے پھیلاؤ کا دوسرا نام ہے۔''(۹)

> ''تہذیب ہو یا ثقافت دونوں ہی افراد کے اجتماعی اندازِ زیست کی ترجمانی کرتی ہے۔ کوئی تہذیب وسیع تناظر میں ثقافت ہی ہوتی ہے۔ تہذیب و ثقافت میں اقدار، معیارات، ادارے اور سوچ کی اقسام شامل ہوتی ہیں جن کو ایک معاشرے کی کئی نسلیں پہلی اہمیت دیتی چلی آتی ہیں۔''(۱۰)

انہی سب تعریفوں کو مد نظر رکھتے ہوئے محمد نعیم ورک نے اپنی کتاب ”اردو ناول کا ثقافتی مطالعہ ‘‘میں مختلف لغات کے حوالے سے ثقافت کے معنی یہ بیان کئے ہیں:

”ان سب تعریفوں کو مجتمع کیا جائے تو ان سے تہذیب، تمدن، ذہنی تربیت، اعلیٰ خصوصیات اور تصورِ حیات، ثقافت کی یہ خوبیاں سامنے آتی ہیں۔“(۱۱)

لیکن بحیثیتِ مجموعی ادب میں تہذیب، ثقافت، تمدن، کلچر جیسے سارے الفاظ ہی موجود ہیں اور ان میں زیادہ فرق روا نہیں رکھا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس پریشانی کا آسان حل یہ بتایا ہے کہ کلچر بنیادی چیز ہے۔ جس کی ذیلی شاخیں تہذیب اور ثقافت ہیں۔ گویا تہذیب و ثقافت دونوں باہم مشترک ہو کر کلچر کی فضاء تشکیل دیتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی کتاب ”پاکستانی کلچر“ میں لکھتے ہیں:

”میں نے لفظ ثقافت اور تہذیب کے معانی کو یکجا کر کے ان کے لئے ایک لفظ کلچر کا استعمال کیا ہے۔ جس میں تہذیب اور ثقافت دونوں کے مفاہیم شامل ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ کلچر ایک ایسا لفظ ہے جو زندگی کی ساری سرگرمیوں کو خواہ وہ ذہنی ہوں یا جسمانی خارجی ہوں یا داخلی احاطہ کر لیتا ہے۔“(۱۲)

الغرض ہمیں ثقافت، تہذیب و تمدن یا کلچر کے الفاظ سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہیں۔ اصل میں یہ سب ایک ہی سکے ثقافت کے مختلف روپ ہیں۔ گویا کلچر یا ثقافت زندگی کی تمام سرگرمیوں پر محیط اکائی کا نام ہے اور انسانی زندگی کا کوئی پہلو اس سے ماورا نہیں ہے۔ ثقافت ہی اقدار اور سوچ کی محافظ اور ضامن ہے اور نسل بعد نسل آگے سے آگے منتقل ہوتی چلی جاتی ہے۔

ii. ثقافت کے عناصرِ ترکیبی

ثقافت ایک ایسی اصطلاح ہے جو زندگی کے ہر ایک گوشے کے لئے راہیں متعین کرتی ہے۔ گویا یوں ثقافت ہماری کل زندگی کا احاطہ کر رہی ہوتی ہے۔ چونکہ ثقافت پوری زندگی کا احاطہ کرتی ہے اس لئے مختلف مصنفین اور محققین نے اپنی اپنی تحقیق کی روشنی میں ثقافت کے مختلف عناصرِ ترکیبی گنوائے ہیں۔ لیکن جس طرح ثقافت کی تعریف پر تمام محققین متفق نہیں ہیں اسی طرح ثقافت کے عناصرِ ترکیبی میں بھی محققین کے ہاں اختلاف نظر آتا ہے۔ یہ اختلاف گو انفرادی طور پر اور بعض شکوں میں ہے۔ لیکن بحیثیتِ مجموعی تمام محققین اس بات کے قائل ہیں کہ ثقافت انسان کی ساری زندگی کی کُل عوامل اور لوازمات کا مجموعہ ہے۔ ثقافت

کے عناصرِ ترکیبی کو ترتیب دیتے وقت محققین اپنے افکار کی روشنی میں بعض اوقات ثقافت کے کسی ایک عنصر کو دوسرے عنصر پر فوقیت دے دیتے ہیں۔ اور پہلے والے کو دوسرے نمبر پر لے آتے ہیں۔ جبکہ دوسرے محققین پہلے محقق سے اختلاف کرتے پھر اپنی فکر کی روشنی میں کسی عنصر کو پہلے اور کسی عنصر کو بعد میں رکھ لیتے ہیں۔ لیکن اس سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا۔

دراصل ثقافت کے عناصرِ ترکیبی کی فہرست بہت طویل ہے۔ جس طرح زندگی کے کل افکارواعمال کا احاطہ کرناانسانی اختیار سے باہر ہے۔ اُسی طرح ثقافت کے عناصرِ ترکیبی کی بھی مدعین فہرست مرتب کرنا مشکل ہے۔ لیکن بحیثیتِ مجموعی اگر ثقافت کے عناصر کی بات کی جائے تو ثقافت کے اندر افکار بنیادی نظریات اور فکر شامل ہے۔ اس کے علاوہ ایمانیات، مذہب، عقائد، عبادات اور مناسک وغیرہ شامل کئے جاتے ہیں۔ افکارو ایمانیات کے علاوہ ثقافت کے اندر کسی معاشرے کے علوم، اسکی زبان، بولیاں، لب ولہجہ، رسم الخط، جبکہ فنونِ لطیفہ جن میں ادبیات، تخلیقات اور پیشہ وارانہ مہارتیں شامل ہوں تمام ثقافت کے زمرے میں شمار کی جاتی ہیں۔ ان عناصر کے علاوہ ثقافت کے اندر انسان کے معاملات، معاشرت، اس کے رہن سہن کے طریق، لباس، حقوق وفرائض، رسم ورواج خواہ خوشی، غمی یا کسی اور جذبے کے اظہار کے ہوں، تقریبات، ایک معاشرے کی عادات، نیکی، بدی، رویے، اسی طرح سیاست و حکومت، نظام و حکومت، داخلی وخارجی سلامتی کے امور، اور قانون سے متعلق تمام معاملات شامل ہوتے ہیں۔ ثقافت کے ذیلی عناصر میں کسی معاشرے کے کھیل، اس کی تفریحات، سیر وسیاحت وغیرہ یہ تمام ان کے اجزاء میں شامل ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے بالترتیب تاریخ، جعرافیہ اور مذہب کو بھی ثقافت کے عناصرِ ترکیبی میں شمار کیا ہے۔[۱۳]

ثقافت کے معاملے میں مذہب ایک متنازعِ فیہ مسئلہ ہے۔ متنازع اس رنگ میں کہ بعض محققین مذہب کو ثقافت کا کُل قرار دیتے ہیں۔ جبکہ بعض محققین اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے مذہب کو ثقافت کا ایک جُز قرار دیتے ہیں۔ لیکن کُل پر محیط کرنے کے قائل نہیں۔ گویا ہم کہہ سکتے کہ زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جو ثقافت کی ذیل میں نہیں آتا، خواہ یہ تکلم سے متعلق ہو خواہ فنونِ لطیفہ سے مذہبی امور، خواہ خاندان اور معاشرتی نظام یا حکومت یا نظام ونسق کا کوئی پہلو ہو ان تمام اکائیوں کی کل کا نام ثقافت قرار دیا جاتا ہے۔ ان میں بعض پہلو کسی ایک محقق کے ہاں بیان ہوئے ہیں تو بعض پہلو کسی دوسرے کے ہاں، لیکن ان کے اجزاء کے بارے میں کسی قسم کا ابہام نہیں ہے یہ ثقافت میں نہیں آتے بلکہ انسانی زندگی کے تمام امورِ ثقافت کے

زمرے میں آتے ہیں۔ لہٰذا انسانی عمل کے مجموعے کا نام ہی ثقافت کو قرار دیا جاتا ہے۔

iii. معاشرے اور زبان کی تشکیل میں ثقافت کا کردار

معاشرہ افراد کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو باہم مل کر نمایاں گروپ تشکیل دیتا ہے۔ معاشرہ کہلانے کے لئے افراد کا اکٹھا ہونا ناکافی نہیں بلکہ ان کے اکٹھا ہونے کے پیچھے کسی مشترکہ خصوصیات کا ہونا بھی ضروری ہے جو کہ ایک دوسرے کے درمیان تعلق کی بنیاد پر ہو۔ اور یہ مشترک اسی شہ پر مبنی ہوتی ہے جنہیں ثقافت پیش کرتی ہے۔ ثقافت سماج کو جوڑنے والی ایسی شہ ہے جو کہ مخصوص گروپ کی خصوصیات، عادات، مثالی نمونے، رویئے، عقائد اور فکری انداز کی عکاسی کرتی ہے۔ نیز ان تعریفوں کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ معاشرے اور ثقافت ایک ہی چیز نہیں تاہم یہ ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ کیونکہ ثقافت کے بغیر کوئی معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا اور معاشرے کے بغیر ثقافت کا تصور لایعنی ہے۔

گویا معاشرے کو اس کی ثقافتی اقدار کی بنیاد پر شناخت ملتی ہے۔ لوگوں کی شخصیت، کردار اور تشخص کی بنیاد پر ہی معاشرے اور قومیں عزت حاصل کرتی ہیں۔ کلچر معاشرتی بندھن ہے۔ اور لوگوں کو متحد رکھتا ہے۔ اس سے طور طریقے سیکھے جاتے ہیں اور اگلی نسلوں تک عمل کے ذریعے منتقل ہوتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر مظفر حسَن ملک:

> "الغرض ثقافت ایک معاشرے کی اکتسابی اہلیت ہے جو کہ افراد کو معاشرے کی طرف سے منتقل ہوتی ہے۔ اس میں روایات، اسلوبِ حیات، اندازِ فکر، احساس اور کردار سب متعین ہوتے ہیں۔ اس میں علم کے عقائد، آرٹ، اخلاقیات، قانون، رسوم وروایات اور وہ تمام عادات جو معاشرے کے زیرِ اثر افراد حاصل کرتے ہیں تمام شامل ہیں۔" (۱۴)

ثقافت کی نمایاں خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ کیونکہ اگر یہ عمل نہ ہو تو ثقافت ختم ہو جائے اس لئے ثقافت کی ترسیل میں معاشرتی تربیت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ زبان بھی ترسیلِ ثقافت میں ایک بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔ درحقیقت زبان انسان کا امتیازی وصف ہے اس لئے زبان کے ذریعے ہی کسی بھی علاقے میں رہنے والے لوگوں کا نقطہ نظر، ثقافت اور مقصدِ حیات سے متعلق ان کے ذہنی ڈھانچے کی عکاسی کی جاتی ہے۔ تاہم ہم اپنے خیالات کا اظہار بھی زبان کے ذریعے اس لئے کرتے ہیں کہ زبان انسانی جذبات کے اظہار کا ایک قدرتی اور

موثر ذریعہ ہے۔ مختصراً یہ کہ زبان میں ہماری انسانی تہذیب و ثقافت، خیالات وجذبات، مشاہدات و تجربات، معاشرت اور فکر وخیال کی تاریخ پنہاں ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زبان کے ذریعے سے پچھلی نسل کے تجربات اگلی نسل تک منتقل ہوتے رہتے ہیں جس سے ثقافت پھلتی پھولتی رہتی ہے۔ اگر زبان نہ ہو تو ثقافت کا پھیلاؤ رک جائے۔ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی کتاب ''ادب اور کلچر'' میں اس بارے میں لکھا ہے:

> ''زبان اور کلچر ترازو کے دو پلڑے ہیں جو قومی اقدار کی میزبان بنتے ہیں اور وہ پہیے جن سے قوم منزلِ مراد کا سفر جاری رکھتی ہے۔ یہ بات اتنی واضح اور دو ٹوک ہے کہ اسے اجاگر کرنے کے لئے تشبیہوں اور مثالوں کی ضرورت نہ ہونی چاہیے۔''(۱۵)

جیسے زبان کے بغیر انسانی زندگی کا تصور نہیں اسی طرح زبان کے بغیر ثقافت کا زندہ رہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جس طرح ثقافت معاشرے کا عکس ہوتی ہے اسی طرح زبان بھی ایک معاشرے کا عکس ہوتی ہے ۔ایک معاشرے میں رہتے ہوئے جب انسان ایک تہذیب کو سیکھنے کی کوشش کرتا ہے تو زبان بھی ایک لازمی جزو ٹھہرتا ہے۔ گویا ثقافت کو سیکھنے اور سمجھنے کے لئے زبان کا ہونا ضروری ہے اور زبان کو سمجھنے کے لئے ثقافت کا سمجھنا بھی نہایت ضروری ہے۔ گویا ایک طرح سے یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ معاشرے، زبان، آرٹ اور مذہب بہترین اشاراتی و مظاہراتی نظام بناتے ہیں جس سے نسل در نسل اس کی اقدار و مظاہر منتقل ہونے کا تسلسل قائم رہتا ہے۔ کھانے پینے، لباس اور عقائد و عبادات میں ہم آہنگی کلچر ہی کی بدولت ہوتی ہے۔ لہٰذا کلچر وہ اہم قوت ہے جو لوگوں اور ان کے اقدار کے نظام کو باہم مربوط رکھتا ہے۔

.iv ثقافتی تنوع

انسان خواہ کسی بھی ملک، قوم، زبان، مذہب یا رنگ و نسل سے تعلق رکھتا ہو کلچر یعنی ثقافت اس کی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالتی ہے۔ کیونکہ ثقافت ہی انسان کے رہن سہن، رسم ورواج، بول چال کا انداز، لباس اور عقائد و نظریات کا فیصلہ کرتی ہے۔ مگر جب ہم تنوع یا ڈائیورسٹی کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہے مختلف ہونا۔ آسان لفظوں میں اس بات کو سمجھنے کے لئے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہر ملک، شہر اور علاقے کی اپنی اپنی ایک الگ ثقافت اور طرزِ معاشرت ہوتی ہے جو انکی ایک پہچان ہوتی ہے۔ اور اسی ثقافت کے ذریعے ہم اس بات کا اندازہ لگاتے ہیں کہ کسی بھی علاقے میں مقیم انسانوں کا مجموعی طور پر طرزِ زندگی کیسا ہے۔ لہٰذا جہاں

بھی مختلف ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہتے ہوں تو اس جگہ پر کلچر ڈائیورسٹی یا تنوع بڑھ جاتا ہے جو کہ ترقی یافتہ دنیا کا ایک خوبصورت طرزِ زندگی ہے۔

> ''کسی بھی کلچر میں تالاب کے پانی ایسی یکسانیت نہیں ملتی بلکہ اس میں تغیر کی لہریں اور دائرے ملتے ہیں اور یہی کلچر کے مختلف روپ، جہات یا پیٹرن ہیں، جو اپنی مجموعی صورت میں موزیک کی مانند ہیں۔''(۱۶)

ہر کلچر میں ایک اکثریت اور بہت سی اقلیتیں ہوتی ہیں۔ یوں کلچر معیاری قواعدو ضوابط (Standard Norms) کا ایک مجموعہ ہوتا ہے۔ جو اس معاشرے کے لئے قابلِ قبول ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر کلچر میں معاشرتی تعامل (Social Interaction) کے بنیادی معیارات پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ذاتی تعلقات میں قربتیں اور فاصلے، میل ملاقات، کھلے عام معاشرے میں تعامل کے انداز اور معاملہ بندی کے طور طریقے وغیرہ۔ اور یہی تنوع ہمارے معاشرے کو دلچسپ اور قابلِ رہائش بناتا ہے۔ لہذا یہی تنوع معاشرے کو ایک ایسی مضبوطی اور طاقت فراہم کرتا ہے کہ معاشرے عالمی معیشت میں بہتر طور پر مقابلہ کر سکتے ہیں۔

ثقافتی تنوع کو یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ مختلف کلچروں کے لوگ ایک دوسرے کے کلچر کا احترام کرتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات ''ثقافتی تنوع'' کی اصطلاح کو غلط معنی دیئے جاتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ ''ثقافتی تنوع'' کو کسی ایک علاقے کے لوگوں اور معاشرے کے کلچر کو دوسرے عالمی معاشروں سے الگ کوئی قسم سمجھا جاتا ہے۔ عالمی ثقافتی گلوبلائزیشن یا عالمگیریت اکثر ثقافتی تنوع پر اثر انداز ہوتی ہے اور عموماً اس کے منفی اثرات بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ دنیا میں مختلف معاشرے وجود میں آئے اور ان کے آپس میں اختلافات بھی تھے جو آج بھی موجود ہیں۔ ان اختلافات میں لباس، زبان اور روایات کے اختلافات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ لیکن ان اختلافات کے باوجود معاشرے اپنی تنظیم کرتے اور اپنے اپنے اخلاقی معیارات کے مطابق ایک دوسرے سے اشتراک پیدا کرتے ہیں۔ اس ثقافتی تنوع کے عمل کو ''یک سوئی یا یک رُخی''(Anologous) سے ''دوطرفہ تنوعی''(Biodiversity) یعنی ایک دوسرے سے زائد تنوع پیدا کرنے والا عامل بھی سمجھا جاسکتا ہے۔

ثقافتی تنوع مخلوط اور مختلف ثقافتوں کی بہت بڑی خوبی ہے۔ یہ واحد اکلوتے کلچر (Mono Culture) کے مقابلے میں زیادہ مفید ہے۔ اور عالمی طور پر واحد کلچر یا ایک ہی طرح کے کلچر کے پیدا کرنے سے ہزار

درجے بہتر ہے کیونکہ اس طرح ایک ہی طرح کے عالمی کلچر کا وجود میں آنا تخریبی عمل ہے جس سے ثقافتیں تباہ ہو سکتی ہیں۔ مخلوط ثقافتوں کے لوگ، نئی زبان، نئی مہارتیں اور سوچنے کے نئے نئے انداز کے ساتھ معاشی، معاشرتی سرگرمیوں میں شامل ہوتے اور اپنی ہنر مندیوں سے مسائل اور مشکلات کے حل کے لئے تخلیقی خدمات سر انجام دیتے ہیں۔ میڈیا اور (ICT) کا استعمال کئی جدتیں پیدا کر رہا ہے اور مختلف کلچر اور تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے باہم افہام و تفہیم پیدا کر رہے ہیں۔ اور ایک دوسرے کو مشترکہ ترقی میں شامل کر رہے ہیں۔ اس طرح ثقافتی تنوع کے حامل لوگ مختلف ممالک، عقائد، زبان رکھنے والے خواتین و حضرات (مردوزن) صلح صفائی سے یک جا اکٹھے کام کرتے نظر آتے ہیں۔ گویا تنوع اس لئے اہم ہے کیونکہ یہ معاشرے کو منفرد اور بے مثال بنا دیتا ہے۔ ثقافت کی خوبصورتی ہی "تنوع" سے ہے۔ لباس عقائد اور مذہب مخصوص اندازِ معاشرت ہی اس معاشرت کا حسن ہیں۔

> "ہم سب جانتے ہیں کہ کلچر کوئی ایسی جنس نہیں کہ جسے درآمد یا برآمد کیا جاسکے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک ہی ملک میں کئی کلچر پائے جاتے ہیں۔ جب زبان جو کلچر ہی کا ایک مظہر ہے چند کوس کے فاصلہ پر کسی حد تک بدل جاتی ہے تو ایک ہی ملک کے مختلف حصوں میں کلچر کا تنوع دیکھنے میں آئے تو یہ کون سی اچنبھے کی بات ہے؟ اس تنوع ہی میں تو کسی ملک کا مجموعی حسن مضمر ہے کہ رنگا رنگ پھولوں کے یکجا ہونے سے گلدستہ مرتب ہوتا ہے۔"(۱۷)

تنوع اس لئے بھی اہم ہے کہ معاشرے اور کلچر کو پر عزم و مستعد رکھنے کا کردار ادا کرتا ہے۔ یہ تنگ نظری کو ختم کر کے نئے خیالات و تصورات پیدا کرتا ہے۔ اور یہ دوسرے کلچر کے لوگوں کے رسومات ورواج اور دیگر ثقافتی طور طریقوں کو کھلے دل سے قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ جو نہ صرف معاشرے بلکہ پوری دنیا کے لئے فائدہ مند ثابت ہوتے ہیں۔ تنوع کی اہمیت مسلم ہے کیونکہ یہ ہر انسان اور اس کے رہن سہن کے طریقوں کو متاثر کرتا ہے۔ بیشک نئے خیالات و تصورات دینا اور معاشرے کو بے مثال بنانا ثقافت ہی کا کام ہے۔ کیونکہ متنوع آراء سے جدید اور مفید ثقافت اجاگر ہوتی ہے۔

ثقافتی تنوع کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اب اقوامِ متحدہ نے بھی اس کی ضرورت و اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس کے لئے ۲۱ مئی کا دن مخصوص کر دیا گیا ہے۔ تاکہ اسی دن کی

مناسبت سے لوگ ایک دوسرے کی ثقافت اور کلچر کو سمجھنے کے لئے باہم مکالمہ کریں۔ یہ چیز ثقافتی تنوع کے لئے نہایت سازگار ثابت ہو سکتی ہے۔

> "اس دن کو منائے جانے کا بنیادی مقصد ثقافتی تنوع اور باہم آہنگی کو فروغ دینا ہے۔ یہ دن لوگوں کو ثقافتی تنوع کے رنگوں کو منانے کا ایک موقع فراہم کرتا ہے۔۔۔اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے قرار دیا کہ ترقی خوشحالی اور ہم اہنگی کے فروغ کے لئے ثقافتی تنوع اور اچھی روایات واقدار کا فروغ ضروری ہے۔"(۱۸)

الغرضیکہ مختلف معاشروں کا کلچر مختلف ہوتا ہے۔ کوئی بھی کلچر کسی بھی معاشرے کا کلچر دیگر کلچروں سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے ہر کلچر دوسرے کلچروں سے متاثر بھی ہوتا ہے اور دوسروں کو متاثر بھی کرتا ہے۔ جدید دور میں اس کو سمجھنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے یہ تاثر انگیزی اور اثر پذیری بالکل واضح نظر آتی ہے۔ اور یوں لگتا ہے کہ مختلف ثقافتیں مشترک بھی ہوتی جارہی ہیں۔ اور ایک دوسرے میں شامل بھی ہوتی جارہی ہیں۔

ج۔ بانو قدسیہ کا تعارف اور ادبی کوائف

i. تعارف

ملک کی مشہور مصنفہ 'بانو قدسیہ' ۲۸ نومبر ۱۹۲۸ء کو فیروز پور (بھارتی پنجاب) میں پیدا ہوئیں۔ اصل نام 'قدسیہ بانو' جبکہ ادبی دنیا میں 'بانو قدسیہ' کے نام سے مشہور ہوئیں۔ وہ ایک ایسے علمی ادبی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں جس نے تحریکِ پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ آپ کے آباؤ اجداد 'جاٹ' برادری کی 'چٹھہ' شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ جس میں خاندان کے بیشتر ارکان کا تعلق زمینداری اور کھیتی باڑی کے پیشے سے تھا۔ لیکن ان کے والد ماجد 'بدرالزماں' ایگری کلچر کے شعبے سے وابستہ تھے۔ وہ ایک زرعی فارم میں مہتمم کی حیثیت سے اپنی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اسی اثناء میں جب بانو قدسیہ ابھی ساڑھے تین برس کی تھیں تو ان کے والدِ محترم عالمِ شباب میں ہی اکتیس برس کی عمر میں وفات پا گئے۔ یوں بانو قدسیہ کی والدہ 'ذاکرہ بیگم' نے ستائیس سال کی عمر میں بیوگی کی چادر اوڑھ لی اور سارے گھر کی ذمہ داری ان پر آن پڑی۔ لہٰذا مسز ذاکرہ چٹھہ نے ایک صابر و شاکر، نیک سیرت، نیک دل اور پاکباز ماں کی حیثیت سے اپنے بڑے بیٹے 'پرویز چٹھہ' اور بیٹی 'بانو قدسیہ' سے اپنا مستقبل اور بقیہ زندگی وابستہ کر دی۔

سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد بانو قدسیہ نے اپنی ابتدائی تعلیم دھرم سالہ (فیروزپور، بھارت) کے ایک سکول سے حاصل کی۔ انہیں بچپن ہی سے کہانیاں پڑھنے اور سننے کا شوق تھا اور یہی شوق چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھنے کا باعث بنا۔ یوں انہوں نے زمانہ طالب علمی سے ہی تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مگر قیامِ پاکستان کے وقت ہجرت کر کے اپنے خاندان والوں کے ہمراہ پاکستان چلی آئیں اور لاہور آکر مستقل سکونت اختیار کر لی۔

پاکستان آکر بانو قدسیہ نے انٹر میڈیٹ اسلامیہ کالج لاہور سے جبکہ کینیرڈ کالج لاہور سے ۱۹۴۹ء میں ریاضی اور معاشیات میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ لیکن ان کی والدہ اب ان کی مزید تعلیم کے حق میں نہیں تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کی اب بانو قدسیہ کی جلد از جلد شادی کر دی جائے۔ اس طرح تقریباً ڈیڑھ سال تک تعلیم یہ کا سلسلہ منقطع رہا۔ چنانچہ پھر والدہ کی ایک دوست کی معاونت سے بانو قدسیہ کو مزید تعلیم کے حصول کی اجازت مل گئی۔ اور یوں بانو قدسیہ نے گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔ اے اردو میں داخلہ لے لیا۔

بانو قدسیہ نے جب گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔ اردو میں داخلہ لیا تو ان کی ملاقات پٹھان خاندان سے تعلق رکھنے والے ایک فرد 'اشفاق احمد' سے ہوئی۔ جو بانو قدسیہ کے ہم جماعت بھی تھے۔ یوں بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کے درمیان ادبی ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کا نتیجہ بڑا خوشگوار نکلا جو کہ ۱۹۵۶ء میں دونوں کی شادی پر منتج ہوا۔ بالآخر بانو قدسیہ کو اشفاق احمد کا ساتھ مل گیا جو بعد میں معروف افسانہ نگار، مترجم، ڈرامہ نویس اور براڈکاسٹر کے طور پر مشہور ہوئے۔ بانو قدسیہ اشفاق احمد کے بارے میں بتاتی ہیں:

"اشفاق صاحب، صاحبِ جمال اور صاحبِ کمال آدمی تھے۔ اس لیے مجھے محبوب ہوئے۔
بات کرنے کا سلیقہ شروع سے ان میں تھا۔"(۱۹)

مگر شادی کے بعد اس لکھاری جوڑے نے نہ صرف اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں گہری دلچسپی لی بلکہ دُکھی انسانیت کی خدمت کے سلسلے میں ان درد آشنا ادیبوں نے ہمیشہ روح بلالی کو اپنا حرزِ جاں بنایا۔(۲۰)

اگرچہ بانو قدسیہ کی زندگی میں کئی نشیب و فراز آئے مگر ے ستمبر ۲۰۰۴ء کو جب اشفاق احمد نے اس جہانِ فانی سے کوچ کیا تو اس ہونی نے بانو قدسیہ کی روح کو زخمی اور دل کو کرچی کرچی کر دیا۔ تاہم اشفاق احمد کے انتقال کے بعد بانو قدسیہ نے نہ صرف اپنا تخلیقی سفر جاری رکھا بلکہ ساتھ ہی ساتھ اپنی تمام تر توجہ اشفاق احمد کی غیر مطبوعہ اور منتشر تحریروں کو جمع کرنے اور مسودات کی صورت میں اشاعت پر مرکوز رکھی۔

بانو قدسیہ نے اپنے آخری ایام میں کمزور ہونے کے باعث گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ آخر کار ۸۸ سالہ بھرپور زندگی گزارنے کے بعد ۲۲ جنوری ۲۰۱۷ء کو طبیعت کی خرابی کے باعث انہیں لاہور کے اتفاق ہسپتال میں داخل کرایا گیا جہاں وہ دس روز تک زیرِ علاج رہیں۔ مگر بروز ہفتہ ۴ فروری ۲۰۱۷ء کو شام ۵ بج کر ۱۵ منٹ پر اس جہانِ فانی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کوچ کر گئیں۔ تدفین اگلے روز یعنی ۵ فروری ۲۰۱۷ء بروز اتوار کو دوپہر ۳ جب کر ۳۰ منٹ پر ان کی نمازِ جنازہ ادا کر کے انہیں اشفاق احمد کے پہلو میں ہی آسودے خاک کر دیا۔ چنانچہ بانو قدسیہ کے انتقال کے بعد اردو ادب کا ایک اور شاندار باب ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ یکے بعد دیگر تمام روشن چراغ آہستہ آہستہ بجھتے جا رہے ہیں۔ بانو قدسیہ نے اپنی زندگی میں جن نامور ادیبوں سے فیض حاصل کیا ان میں اشفاق احمد، قدرت اللہ شہاب اور ممتاز مفتی کا نام نمایاں ہے۔ البتہ بانو قدسیہ کی وفات سے اردو افسانے کا یہ دور اپنے اختتام کو پہنچا جن کی تابانیاں قرۃ العین، عبد اللہ حسین، اشفاق احمد اور انتظار حسین کی مرہونِ منت تھا۔

بلاشبہ علم دوستی اور ادب شناسی نے ان کی صلاحیتوں کو جلا بخشی اور یوں محنت، لگن اور ذوق و شوق سے ایک حساس شخصیت کو ادیبہ بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بانو قدسیہ کا شمار اردو ادب کی اہم ترین شخصیت میں ہوتا ہے۔ کیونکہ کسی بھی ادیب یا رائٹر کی تحریریں اس کی شخصیت کا بہترین عکاس ہوتی ہیں۔ اور یہ کمالِ خوبی بانو قدسیہ کے اندر بھی موجود تھی۔ ممتاز مفتی اپنے افسانے ''پتی بھگتی'' میں بانو قدسیہ کی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''بانو قدسیہ کو غالباً کوئی بھی نہیں جانتا اس لئے کہ بانو قدسیہ ایک نہیں دو افراد ہیں جس طرح کسی کسی بادام میں دو مغز موجود ہوتے ہیں۔ اسی طرح بانو قدسیہ کی شخصیت کے دو پہلو ہیں۔ الگ، الگ۔ ایک بانو، دوسری قدسیہ۔''(۲۱)

بالآخر دنیا بھر میں بانو قدسیہ کی علمی، ادبی، قومی اور ملی خدمات کا نہ صرف اعتراف کیا گیا بلکہ انہیں خوب سراہا بھی گیا۔ وہ اپنے اس لافانی اسلوب کے اعتبار سے جتنی بڑی ادیبہ تھیں، شخصیت اور وقار کے لحاظ سے اتنی ہی عظیم خاتون بھی تھیں۔ حلقہ احباب میں انہیں ''بانو آپا'' کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔ ان کی شخصیت ہمہ جہت صفات کی حامل تھی۔ بانو قدسیہ ایک سعادت مند بیٹی، عقلمند طالبہ، منفرد اسلوب کی حامل ادیبہ، تابعدار اہلیہ اور اپنی اولاد کا خیال رکھنے والی، سادہ اور ملنسار، زندگی گزارنے والی خاتون، انسانیت کی قدر

کرنے والی، فکر و عمل کی آزادی کی قائل، حق و گو، وطن اور ملت سے بے انتہا محبت اور دلی وابستگی رکھنے والی ایسی خاتون تھیں جن کا دیا ہوا اعرفان عرصہ دراز تک لوگوں کے ذہنوں میں تازہ رہے گا۔

ii. ادبی کوائف

بانو قدسیہ اردو ادب سے گہرا شغف رکھتی تھیں۔ جو ان کی عملی زندگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ انہوں نے زندگی کے ہر شعبے میں اپنی خداداد صلاحتوں اور تخلیقی قوتوں کا لوہا منوایا ہے۔ دنیا بھر کے مصنفین اور ادباء ان کی صلاحیتوں کے معترف ہیں۔ وہ ایک ایسی مستعد تخلیق کار تھیں جنہوں نے دو نسلوں کی آبیاری کی اور اپنے علم سے انہیں سراب کیا۔ تاہم ان کے اہم موضوعات میں ادب، فلسفہ، نفسیات اور صوفی ازم شامل ہیں۔

بانو قدسیہ نہ صرف افسانوں، ناولوں اور ڈراموں سمیت نثر کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی بلکہ ریڈیو اور ٹی وی پر بھی کافی عرصے تک حرف وصوت کے اپنے رنگ جماتی رہیں۔ ۱۹۸۱ء میں شائع ہونے والا ناول "راجہ گدھ" ان کی حقیقی شناخت بنا اور مصنفہ کو اس ناول پر صدارتی ایوارڈ بھی ملا۔ ذوقِ سلیم سے متمتع اردو ادب کے قارئین بانو قدسیہ کو اردو نثر کی ملکہ عالیہ گردانتے تھے۔ بلاشبہ مسلسل سات دہائیوں تک ادبی گوشے میں اسی ملکہ (بانو قدسیہ) کے نام کا سکہ چلتا رہا۔

۲۰۰۳ء میں حکومتِ پاکستان نے بانو قدسیہ کو علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں ستارہ امتیاز سے نوازا جبکہ ۲۰۱۰ء میں انہیں حلالِ امتیاز سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ موصوفہ نے ٹی وی ڈراموں پر بھی کئی ایوارڈ اپنے نام کئے۔

iii. تصانیف:

الف۔ افسانے

کچھ اور نہیں۔ ۱۹۷۶ء

دوسرا دروازہ۔ ۱۹۹۱ء

بازگشت۔ ۱۹۹۳ء

آتشِ زیرپا۔ ۲۰۰۰ء

امر بیل۔ ۲۰۰۲ء

سامانِ وجود۔ ۲۰۰۲ء

نا قابلِ ذکر۔ ۲۰۰۲ء

دستِ بستہ۔ ۲۰۰۳ء

ہجرتوں کے درمیاں۔ ۲۰۱۰ء

ب۔ ناول / ناولٹ

راجہ گدھ۔ ۱۹۸۱ء

ایک دن۔ ۲۰۰۲ء

حاصل گھاٹ۔ ۲۰۰۳ء

موم کی کلیاں۔ ۲۰۰۳ء

شہرِ بے مثال۔ ۲۰۰۵ء

شہرِ لازوال، آباد ویرانے۔ ۲۰۱۲ء

ج۔ ڈراموں کی گیارہ کتب / پنجابی ڈراموں کے دو مجموعے

آدھی بات۔ ۱۹۹۱ء

فٹ پاتھ کی گھاس۔ ۲۰۰۱ء

حوا کے نام۔ ۲۰۰۲ء

لگن اپنی اپنی۔ ۲۰۰۳ء

پیا نام کا دیا۔ ۲۰۰۳ء

سورج مکھی۔ ۲۰۰۴ء

دوسرا قدم۔ ۲۰۰۴ء

تماثیل۔ ۲۰۰۵ء

بند گلی۔ ۲۰۰۹ء

حوالہ جات

۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۴۸

۲۔ عثمان فاروق، ڈاکٹر، اردو ناول میں مسلم ثقافت، بیکن ہاوس، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۱۱

۳۔ نظیر صدیقی، تفہیم و تعبیر، کارواں ادب، ملتان، ۱۹۸۳ء، ص ۲۸۴

۴۔ روتھ بینی ڈکٹ، ڈاکٹر، نقوش ثقافت، مترجمہ سید قاسم محمود، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد،

۲۰۱۲ء، ص ۲۷۹

۵۔ نصیر احمد، ناصر، ڈاکٹر، اسلامی ثقافت، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۵۲

۶۔ سید عبد اللہ، ڈاکٹر، کلچر کا مسئلہ، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۵

۷۔ ایم خالد فیاض، کلچر اور سویلزیشن کے اردو متبادلات و مفاہیم، مشمولہ: دریافت، شمارہ ۵، ۲۰۱۰ء، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۶۹۲

۸۔ ابوالاعجاز، حفیظ صدیقی (مرتب)، کشافِ تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۵۴

۹۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، کلچر اور پاکستانی کلچر، (مضمون) مشمولہ: پاکستانی ثقافت، مرتبہ رشید امجد، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۹ء، ص ۲۰۸

۱۰۔ سیموئیل پی ہنٹنگٹن، تہذیبوں کا تصادم، مترجمہ محمد احسن بٹ، نگارشات، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۳۲

۱۱۔ محمد نعیم ورک، اردو ناول کا ثقافتی مطالعہ (۱۹۶۹ تا ۱۹۴۷)، کتاب محل، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۴

۱۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، ص ۴۸

۱۳۔ عبد السلام خورشید، ڈاکٹر، پاکستانی ثقافت، (مضمون) مشمولہ: پاکستانی ثقافت، مرتبہ رشید امجد، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۹ء، ص ۲۱۷

۱۴۔ مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، ثقافتی بشریات، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء، ص ۳۵

۱۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ادب اور کلچر، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص ۳۱۵

۱۶۔ ایضاً، ص ۳۲۰

۱۷۔ سجاد نقوی، پاکستانی ثقافت کی شناخت، (مضمون) مشمولہ: پاکستانی ادب، مرتبہ رشید امجد / فاروق علی، فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج، راولپنڈی، ۱۹۸۱ء ص ۱۸۱

۱۸۔ روزنامہ نوائے وقت، ایڈیٹر رمیزہ مجید نظامی، ثقافتی تنوع برائے فروغ مکالمہ و ترقی کا عالمی دن، بتاریخ ۸ نومبر ۲۰۱۹، بوقت ۹ بجے صبح https://www.nawaiwaqt.com.pk/22-May-2017/607374

۱۹۔ اصغر عبداللہ، بانو قدسیہ کا حیات و فن، (انٹرویو) مشمولہ: بانو قدسیہ: شخصیت اور فن، مرتبہ انور سدید، ڈاکٹر، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۱۸

۲۰۔ غلام شبیر، ڈاکٹر، (مضمون) بانو قدسیہ: کس سمت لے گئیں مجھے اس دل کی دھڑکنیں، بتاریخ ۵ اکتوبر ۲۰۱۹، بوقت ۱۲ بجے دوپہر http://www.urdulinks.com/urj/?p=1463

۲۱۔ ممتاز مفتی، بانو قدسیہ: پتی بھگت، (مضمون) مشمولہ: اور اوکھے لوگ، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۱۵۵

باب دوم

'حاصل گھاٹ' میں پاکستانی اور امریکی ثقافت کی سماجی شناختیں

الف۔ عالمگیریت کا معاشی اور سماجی تناظر:

جدید ذرائع ابلاغ اور سائنسی ترقی کی بدولت دنیا آج ایک گلوبل ویلج کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ اس گلوبل ویلج کی تعمیر میں سائنسی ترقی کے ساتھ دوسرا براہ راست تعلق معاش کا ہے۔ درحقیقت معاشی ترقی ہی نے جدید دنیا کی بنیادیں استوار کیں۔ اسی گلوبل ویلج نے دنیا کی تمام ثقافتوں پر اپنے اثرات مرتب کئے۔ یہ اثرات دراصل عالمگیریت کی ہی ایک ذیلی شاخ بن کر دنیا کے سامنے آرہے ہیں۔ اسی بنا پر آج دنیا میں عالمگیریت کا بہت چرچا ہے۔ خصوصاً دنیا کے گلوبل ویلج بننے کے بعد دنیا کا ایک بڑا حصہ بلواسطہ یا بلاواسطہ طور پر اس سے متاثر ہے۔ اس لئے آگے بڑھنے سے پیشتر عالمگیریت پر ایک نظر دوڑاتے ہیں۔

I. عالمگیریت کیا ہے؟

اردو میں اصطلاح "عالمگیریت" انگریزی اصطلاح Globalization کے مترادف کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ اس لئے عالمگیریت کو اچھے طور پر سمجھنے کے لئے پہلے اس کی انگریزی تعریف جاننا لازم ٹھہرتا ہے۔ آکسفرڈ ایڈوانسڈ لرنرز ڈکشنری(Oxford Advanced Learner's Dictionary) میں لفظ گلوبلائزیشن کو کچھ یوں بیان کیا گیا ہے:

> "The fact that different cultures and economic systems around the world are becoming connecting and similar to each other because of the influence of large MULTINATIONAL companies and of improved Communication."(۱)

اس کا اردو میں آسان فہم ترجمہ یہ بنتا ہے کہ دنیا کی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے زیر اثر آنے اور ذرائع مواصلات کی ترقی کی وجہ سے دنیا کی مختلف ثقافتیں اور معیشتیں ایک دوسرے سے قریب آتی جا رہی ہیں۔ یہ گلوبلائزیشن کا بالکل سادہ سا تصور ہے۔ جس کے لئے فارسی میں "جہاں سازی" اور اردو میں "عالمگیریت" کا

لفظ رائج پا رہا ہے۔[۲] لفظ عالمگیریت بنیادی طور پر عالم گیر سے نکلا ہے جس کے معانی ''جہاں کو زیر کر لینے والا، دنیا میں پھیلا ہوا، عالم پر چھایا ہوا یا تمام دنیا''[۳] کے ہیں۔ گویا کہ انگریزی اور اردو کی تعریفوں کو ملا کر دیکھا جائے تو یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ عالمگیریت در حقیقت ملٹی نیشنل کمپنیوں کے زیر اثر ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینا چاہتا ہے جس میں دنیا کی ثقافتیں اور معیشتیں باہم متحد ہو کر ایک ہو جائیں۔ بقول ناصر عباس نیر:

''گلوبلائزیشن کی آزادانہ اور متنوع نقل و حرکت کے اثرات تین طرح کے ہیں۔ سیاسی، معاشی اور ثقافتی۔ دوسرے لفظوں میں گلوبلائزیشن کے ذریعے ملٹی نیشنل کمپنیاں سیاسی اور معاشی اور ثقافتی غلبہ حاصل کرتی ہیں اور اس کے لئے قانون شکنی سے لے کر قانون سازی ہر طرح کے اقدامات کو جائز سمجھتی ہیں۔''[۴]

بظاہر سننے اور پڑھنے میں یہ ایک مسحور کن تصور ہے لیکن یہ اپنے اندر ایک بھیانک روپ رکھتا ہے، ایک ایسا خیال جس کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ یہ اجارہ داری کا ایک نیا روپ ہے جس میں چند عالمی کمپنیاں باقی دنیا کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنانے کی تگ و دو میں مصروف عمل ہیں۔ عالمگیریت کے اس فسانے کا ذکر ڈاکٹر سلیم اختر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''ان دنوں Globalization کا چرچا عام ہے یعنی تمام جغرافیائی، تاریخی، مذہبی، سیاسی، لسانی اختلافات کے باوجود افراد و اقوام ایک عالمی برادری کے رکن ہیں (یا ہونا چاہیے)۔ بظاہر تو یہ بڑا پر کشش تصور اور اعلیٰ آئیڈیا نظر آتا ہے لیکن عملاً نہ صرف یہ کہ ناممکن ہے بلکہ ۹/۱۱ کی بعد کی صورتحال نے مسلمانوں کے خلاف جس تعصب اور نفرت کو جنم دیا ہے اس تناظر میں تو یہ خاص مضحکہ خیز بھی محسوس ہوتا ہے۔''[۵]

عالمگیریت نے دنیا کے تقریباً ہر شعبے پر اپنا اثر چھوڑا ہے جیسے سماج، معاشرہ، ثقافت، مذہب، خوراک، تاریخ، سیاست، جغرافیہ اور لسان وغیرہ لیکن جس شعبہ ہائے زندگی نے اس سے سب سے زیادہ اثر قبول کیا ہے وہ معاشیات ہے۔ ابتدائی صنعتی دور میں اشیا ضرورت کے حساب سے تیار کی جاتی تھیں، جو فی الفور اپنے علاقے میں فروخت یا استعمال ہو جاتی تھیں۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ ملٹی نیشنل کمپنیوں کی آمد کے سبب اشیا یا مصنوعات کی مانگ میں تو اضافہ ہوا لیکن اس کے ساتھ کمپنیوں نے مصنوعات کی تیاری کا ایک ایسا سانچہ تیار کیا جس میں ضرورت سے زائد اشیا تیار کی جانے لگیں۔ جب مصنوعات ضرورت سے زائد تیار کی جانے

لگیں تو اس امر کی ضرورت پیش آئی کہ انہیں فروخت کے لئے عوام کے اذہان میں ان اشیا کے لئے رغبت بھی پیدا کی جائے۔انٹر نیٹ کے فروغ اور دنیا کے گلوبل ویلج بننے نے اس کام میں نہایت سہولت پیدا کر دی۔اشتہار سازی کی صنعت پروان چڑھی،عام سے عام اور بغیر ضرورت ،اشیا کی ضروت پیدا کی جانے لگی۔جس نے معیشت کے ساتھ ساتھ ہمای ثقافت کو بھی شدید نقصان پہنچایا:

''میڈیا خود ایک کارپوریشن بن چکا ہے مفادات کی خاطر سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ بنا کر پیش کر رہا ہے۔معلومات دینے کی بجائے ذہن سازی کر رہا ہے Reality کی بجائے Recreated Reality پیش کر رہا ہے جسے ہائپر ریالٹی بھی کہا جاتا ہے۔صارفیت کے دائرے کو بڑھانے کے لئے ٹی وی انٹرنیٹ سے اشتہار بازی کی جا رہی ہے اور اس عمل میں مقامی ثقافتوں کے اقداری نظام بری طرح شکست وریخت کا شکار ہو رہے ہیں۔'' (۶)

یوں دنیا کے ہر کونے میں یہ دیکھے بغیر، کہ وہ خطہ ان اشیا کو استعمال کرنے کی اہلیت رکھتا ہے یا نہیں، دھڑا دھڑ امصنوعات کی ترسیل عمل میں آئی۔اس چیز نے دنیا کی ثقافت،سماج اور معیشت پر گہرے اثرات مرتب کئے،جس نے دنیا کا نقشہ ہی بدل دیا۔مان مانی حکومتوں کو اقتدار سپرد کیا جانے لگا۔ہر وہ عامل جو عالمگیریت کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا تھا،اسے راستے سے ہٹا دیا جانے لگا۔نتیجتاً دنیا چند ہاتھوں یا کمپنیوں کے شکنجے میں پھنس کر رہ گئی ہے۔یہ عالمگیریت کی ایک عام فہم شکل کا نمونہ ہے۔

لیکن ایسا بھی نہیں کہ عالمگیریت صرف معیشت کے میدان میں ہی دنیا کو متاثر کر رہی ہے۔ عالمگیریت سے معیشت کے ساتھ ساتھ پورا سماجی ڈھانچہ بھی متاثر ہو رہا ہے۔یوں سماجی عالمگیریت کا بھی ظہور ہو رہا ہے بلکہ یوں کہنا زیازہ مناسب ہو گا کہ سماجی عالمگیریت بھی ساتھ کے ساتھ تشکیل پا چکی ہے۔ایسے میں آگے بڑھنے سے پہلے سماجی عالمگیریت پر ایک نظر دوڑاتے ہیں۔

II. سماجی عالمگیریت

سماج انگریزی کے لفظ سوسائٹی کے متبادل کے طور پر اردو میں مستعمل ہے۔گویا سماج عرف عام میں معاشرے کو ہی کہتے ہیں۔سماج چونکہ پوری ثقافت کا آئینہ دار ہوتا ہے اس لئے جب ہم سماجی عالمگیریت کی بات کریں گے تو اس کے اندر زندگی کے تمام شعبے در آئیں گے۔گویا عالمگیریت صرف معاشیات تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ اس نے اپنا پھیلاؤ پوری زندگی پر کر لیا ہے۔جب ہم اس نظریے سے عالمگیریت کو دیکھتے ہیں تو

اس کی ایک متوحش شکل سامنے آتی ہے۔ہنوز جس سے سادہ لوح عوام لاعلم ہے۔

جیسا کہ ہم نے ابھی کہا ہے کہ عالمگیریت نے اپنے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس سے سارا سماج متاثر ہوا ہے۔بقول لال خان ’’اکیسویں صدی کے آغاز پر پورا عالم انتشار کی شدید کیفیت میں مبتلا ہے،اتنی بے چینی، مسلسل خونریزی،غربت اور امارت میں تفریق اور اتنا گہرا سماجی بحران انسانی تاریخ نے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہو گا۔‘‘(۷) اندازہ کریں کہ ہماری قومی زبان اردو ہے لیکن ہمیں انگریزی پسند ہے، حتیٰ کہ ہمارا ذریعہ تعلیم بھی انگریزی ہے اور لوگ اپنے بچوں کو انگریزی اسکول میں پڑھانا باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ہماری نئی نسل جینز شرٹ کی دلدادہ ہے۔اسی تناظر میں اگر کھانے پینے کی بات جائے تو کے ایف سی، مکڈانلڈ اور پیزاہٹ جیسی برانڈز نے چاروں اُوراپنا حلقہ پھیلایا ہوا ہے۔ناصر عباس نیر انہیں باتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’کم از کم بڑوں شہروں میں رہنے والے لوگ وہی لباس پہننے لگے ہیں جو عالمی ہے، کم پاکستانی ہوں گے جو اپنے لباس سے پہچانے جاتے ہوں کہ وہ پاکستانی ہیں۔اکثریت وہی کھانے کھانے لگے ہیں جو امریکی، یورپی، چینی، جاپانی وغیرہ ہیں۔فاسٹ فوڈ ثقافتی عالمگیریت کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ہر صاحبِ حیثیت کا بچہ عالمی تعلیم حاصل کرتا ہے،یعنی انگریزی میں مغربی طرز کی تعلیم۔جو صاحب حیثیت نہیں وہ اس کی آرزو رکھتے ہیں۔‘‘(۸)

کہنے کو یہ ایک سادہ سی بات ہے کہ کھانے کی چیز بھلا معاشرے کو کیسے متاثر کر سکتی ہے لیکن یہ حقیقیت ہے اور آج کی بیماریاں خواہ وہ ہائی بلڈ پریشر ہو، شوگر، بدہضمی، صحت کے دیگر مسائل، ان سب میں کلیدی کردار انہی فوڈ چینز کا ہے۔جب معاشرہ اس نہج پر چل پڑا اور بیماریاں پیدا ہوئیں تو میڈیسن کا شعبہ سامنے آ گیا۔مہنگی سے مہنگی دوائیاں، ہربل ٹریٹمنٹ، خوبصورتی اور میک اپ سے متعلقہ برانڈ متعارف ہو گئیں۔ہمارا معاشرہ سادہ کپڑے پہننے اور ننگ ڈھانپنے پر یقیین رکھتا تھا۔کپڑوں کی برانڈز نے سارے کا سارا معاشرہ ہی کپڑے خریدنے کی لت میں مبتلا کر دیا ہے۔بازاروں کی رونقیں اس بات کی چغلی کھاتی معلوم ہوتی ہیں۔

بڑوں کا ادب آداب ہو، معاشرے کا رکھ رکھاؤ، قناعت، سادگی یا سخاوت ہر رنگ میں م عاشرے میں بدلاؤ آ گیا ہے۔پہلے عوام داستانیں سن کر یا بھانڈ کی جگتوں سے دل بھلاتی تھی، معاشرہ ایک دوسرے کو وقت دیتا تھا، بات کرنے اور بات سننے کا وقت وافر میسر آتا تھا۔گھر والے اپنے مسائل ایک دوسرے کے ساتھ بیان

کر لیتے تھے۔ لیکن پھر اولاً تھیٹر آیا، پھر سینیما نے عوام کو اپنے سحر میں جکڑ لیا، ابھی عوام سینیما میں مگن تھی کہ ٹی وی بھی آ گیا۔ رہی سہی کسر انٹرنیٹ نے پوری کر دی۔ آج یہ عالم ہے کہ عوام گھر سے زیادہ وقت سوشل میڈیا پر گزارتی ہے، حقیقی دوست کم اور افسانوی دوست یعنی سوشل میڈیا کے دوست زیادہ ہوتے ہیں۔ لوگ دوسروں کے مسائل حل کرنے کے درپے ہیں جبکہ اپنے گھر کی کسی کو نہ خبر ہے اور نہ پروا۔ سارا معاشرہ ایک خواہ مخواہ کے خبط میں گرفتار ہے۔ باقر مہدی کے خیال میں ہماری تنہائی، اکثر نفسیاتی الجھنوں، پریشانیوں وغیرہ میں سب سے بڑا ہاتھ اسی میڈیا، سائنس اور ٹیکنالوجی کا ہے۔ اسی کی بدولت انسان سب کچھ ہونے کے باوجود اندر سے نامکمل اور تنہا ہے۔ اسی کی بدولت اخلاق اور اقدار کی دیواریں آہستہ آہستہ کر کے گرتی چلی جا رہی ہیں۔ جنسی سرگرمیوں اور جرائم میں ہوشربا اضافہ اسی میڈیا اور ٹیکنالوجی کے غلط استعمال کی دین ہے۔ (۹)

نتیجتاً آج ہم اپنی ثقافت کے روشن پہلوؤں کو بھول بیٹھے ہیں۔ انگریزوں کی غلامی کی سبب ہمیں پہلے ہی سے اپنی ثقافت و سماج میں زیادہ برائیاں نظر آتی تھیں، لیکن سماجی عالمگیریت نے تو ہمارے سماج کو یکسر ادل بدل کر رکھ دیا ہے:

> ''اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اپنی ثقافت کے روشن پہلوؤں کو بھی بھول بیٹھے۔ مغرب کی چمک دھمک نے انگریزی تعلیمات کے زیر اثر ہمارے اپنے علمی اثاثے کو حقیر بنا کر رکھ دیا ہے اور ہمارا اپنا رویہ اپنے ہی ورثے کے معاملے میں معاندانہ ہو گیا ہے۔ یوں بھی مغرب کے مقابلے میں غلامی کے باعث مشرق ایک ذیلی تہذیب کی رکھتی ہے جس میں محاسن کم اور معائب زیادہ ہیں۔''(۱۰)

چونکہ عالمگیریت میں سرمایہ داری ایک خاص اہمیت کی حامل ہے، اسی سبب سرمایہ دار ہمارے سیاسی ڈھانچے کو بھی بری طرح متاثر کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں سیاستدان منتخب ہو کر آتے ہیں اس لئے وہ عوام کو جوابدہ ہوتے ہیں۔ لیکن سرمایہ دار بادشاہ گر ہوتے ہیں۔ وہ ایسے لوگوں کو حکومت سونپتے ہیں جو ان کے ارادوں کی تکمیل میں رکاوٹ نہیں بنتے۔ وہ امیروں کو امیر تر اور غریبوں کو غریب تر بناتے چلے جاتے ہیں۔ وہ یوں غریبوں اور محنت کشوں کا استحصال کرتے ہیں:

> ''سرمایہ دار مملکت کو بھی اپنے مقصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ وہ اس کے ذریعے غریبوں اور محنت کشوں کا استحصال کرتے ہیں تاکہ ان کو ابھرنے کا موقع نہ مل سکے اور

دولت کم سے کم ہاتھوں میں رہے۔سیاسی طاقت بھی انہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو معاشی طور پر طاقتور ہوں۔چنانچہ نظام سرمایہ داری میں مملکت پر درحقیقت سرمایہ داروں کا کنٹرول ہوتا ہے۔وہ خود بادشاہ نہیں ہوتے لیکن بادشاہ گر ہوتے ہیں۔"(۱۱)

سماجی عالمگیریت اعلیٰ دماغوں کو اسکالرشپ دے کر اپنے ہاں بلا لیتے ہیں جبکہ ناقص مواد کو پیچھے بے یارومددگار چھوڑ دیا جاتا ہے۔ہماری نوجوان نسل کو عریانیت کی بھینٹ چڑھایا جارہا ہے۔دماغی اپاہج پیدا کئے جارہے ہیں،سوچنے سمجھنے کی قوت نوجوانوں سے دور جاتی چلی جارہی ہے۔تمام کی تمام ثقافتی اقدار کا جنازہ نکلتا محسوس ہوتا ہے۔والدین کے لئے اولڈ ہاؤس بنانے کا خیال درآمد کیا جارہا ہے۔زیادہ سے زیادہ کمانے اور سارے کا سارا خرچ کرنے کے خبط میں ہر کوئی گرفتار نظر آتا ہے۔یہ وہ نقشہ ہے جس کے مطابق موجودہ زمانے میں سماجی عالمگیریت ظہور پذیر ہورہی ہے۔

III. حاصل گھاٹ میں سماجی عالمگیریت اور معاشی تناظر:

بانو قدسیہ کا ناول "حاصل گھاٹ" نہایت خوبصورتی سے عالمگیریت کے سماجی اور معاشی تناظر کا نقشہ دکھاتا ہے۔عالمگیریت نے دنیا کو،سماجی و معاشی حوالے سے،ایک اکائی میں ڈھالنے کی خاطر جس طرح متاثر کیا ہے،اس کا حاصل گھاٹ میں عمدہ اظہار موجود ہے۔

بانو قدسیہ کی نظر میں آج کی ترقی یافتہ دنیا میں اگر مختلف قوموں کے گراف کو دیکھا جائے تو وہی اقوام آپ کو سرِ فہرست نظر آئیں گی جنہوں نے اپنی شب و روز کی محنت کے بل بوتے پر اپنی معاشی، معاشرتی، تہذیبی اقدار کو پروان چڑھا کر اپنا لئے ایک ایسا مقام بنالیا ہے کہ اب وہ اس قابل ہوگئی ہیں کہ دوسری قومیں ان کی راہنمائی یا امداد لے سکیں۔اس کے برعکس ترقی پذیر قومیں اپنی ترقی کے لئے دن رات کوشاں تو ہیں لیکن ابھی وہ نہ تو پورے طور پر خود کفیل ہوئی ہیں اور نہ ہی اپنی اقدار کو پورے طور پر پروان چڑھا سکی ہیں۔اور انہیں اپنے مسائل سے نکلنے کے لئے ہمیشہ ترقی یافتہ اقوام سے مدد لینا پڑتی ہے۔جس کے نتیجہ میں ترقی یافتہ ممالک (اہلِ مغرب) جو دنیا میں اپنا لوہا منوا چکے ہیں ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک کے حق میں جابرانہ رویہ رکھتے ہیں اور ان کی مدد کر کے ان کے عقائد و نظریات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔اپنے مسائل خود حل کرنے کی وجہ سے اہلِ مغرب کے ہر فیصلے میں خود اعتمادی جھلکتی ہے،جس سے اہلِ مشرق نابلد ہیں کیونکہ وہ زیادہ تر فیصلے اپنے بڑوں کی تابعداری میں لیتے ہیں۔بانو قدسیہ کے نزدیک مشرق کی پسماندگی کے عوامل میں سے یہ بھی ایک اہم عمل

ہے جس کا ذکر وہ ''حاصل گھاٹ''میں کچھ یوں بیان کرتی ہیں۔

''انسان کو غالباً سب سے زیادہ تحکم کا شوق ہے۔ وہ دوسروں پر کبھی رُعب، کبھی خوشامد، کبھی سزا دے کر اپنی حکومت کا ثبوت اپنی انا کو پہنچاتا رہتا ہے۔۔۔مذہب، قانون، ماں باپ، استاد، رسم ورواج کسی قسم کی بھی اطاعت ہو تو انسان تابع کی حیثیت میں فیصلے کرتا ہے۔ اسے فیصلوں کے لئے اپنے اندر کے بجائے باہر کی آواز حق پر اعتماد کرنا پڑتا ہے۔ ماننے والے پر فیصلے کی ذمہ داری اٹھ جاتی ہے۔ اس بوجھ کے اٹھتے ہی وہ صاحبِ اختیار بھی نہیں رہتا اور اسی لئے اپنے پر بھروسہ کرنا اس کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔ ترقی کے لئے اپنے فیصلے پر اعتماد کرنا انتہائی اہم ہے۔ اسی خود اعتمادی کے سہارے مغربی معاشرے میں ترقی کا پہیہ جام نہیں ہوتا۔''(۱۲)

اس حقیقت کو اب جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ مشرق سمیت پوری دنیا میں اب امریکی ثقافت کی یلغار اور حشر سامانیاں کسی کی آنکھ سے اوجھل نہیں رہیں۔ اگرچہ اس سے پہلے انگریزی تہذیب کو بالادستی حاصل تھی۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں جنگِ عظیم دوم کے بعد جب مغرب میں طاقت کا محور یورپ سے ہٹ کر امریکہ کو منتقل ہو گیا تو اگر اس وقت امریکہ کی پشت پناہی نہ ہوتی تو روس سے بڑھتے ہوئے انقلاب کا سیلاب مغربی یورپ کو بہالے جاتا۔ مگر وقت نے اس پیشگوئی کو غلط ثابت کر دیا کہ سرمایہ داری کی اندرونی کشمکش اور سمندر پار کی نو آبادیوں کی آزادی کے بعد مغربی یورپ کا پرانا معاشرہ لامحالہ منہدم ہو گا اور اس کی جگہ انقلاب کا پرچم لہرائے گا۔ البتہ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد جیسے ہی انگریزی سلطنت کے رُعب و دبدبے میں کمی واقع ہوئی تو فوراً ہی امریکی قدم اس خلا کو پُر کرنے کے لئے آگے بڑھ آئے۔ اور یوں وہ قوم اور تہذیب جس کو انگریز خودرو گھاس سے تشبیہ دیتے تھے دنیا کا مطمہ نظر اور قبلہ و کعبہ بن گئی۔

''امریکہ کو یورپ والوں نے طعنے دیئے تھے کہ امریکی بھی کوئی لوگ ہیں۔ جن کا نہ کوئی کلچر، نہ کوئی زبان، نہ کوئی ہسٹری، نہ ان کے آثارِ قدیمہ۔ اس خودرو گھاس جیسی جنگلی تہذیب کے مالکوں نے ثقافتی برتری والوں کا تکبر ریزہ ریزہ کر دیا۔۔۔ آج امریکہ کی جدیدیت ہی سارے پرانے کلچروں کو کھا گئی۔ امریکہ کی ہسٹری ان کی سڑکیں اور بازار ہیں۔ ان کی امریکن زبان ساری زبانوں کو اکھاڑے میں پچھاڑ چکی ہے حتیٰ کہ جو انگریزی انگریزوں کی دستار تھی، وہ بھی اسے اتار کر امریکنوں کے قدموں میں رکھ چکے ہیں۔''(۱۳)

لیکن مشرق کا ماجرہ ہی الگ ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب مسلمان دین کی دولت سے مالا مال تھے اور انہیں تمام اقوام پر برتری حاصل تھی۔ انہوں نے ذات پات اور رنگ و نسل کے امتیاز سے دور رہ کر اخوت، مساوات، روحانیت، عدل، کفایت شعاری اور خدمتِ خلق اور ذکر و فکر کی شمع لے کر نورِ حق کی روشنی سے ساری دنیا کو روشن اور منور کر دیا۔ یوں انہوں نے اسلامی تعلیمات واقدار کو ترقی کا زینہ بنا کر زندگی کے ہر میدان میں کامیابی حاصل کی۔ لیکن جیسے ہی مسلمانوں کے اندر ایمانی طاقت کمزور پڑی اور وہ زندگی کی اعلیٰ قدروں کا ساتھ دینے میں ناکام ہوئے تو آخر کار زوال کا شکار ہو گئے۔ نتیجتاً مخالف قوتیں ان پر غالب آ گئیں جس کے باعث وہ آج تک محکوم و مغلوب ہو کر رہ گئے ہیں۔

> ''ایک زمانہ تھا جب مشرق نے ساری دنیا کو فلاح کی ترقی عنایت کی تھی اور واضح بات ہے کہ مذہب، صبر، توکل، بھائی چارہ، محبت، اخوت جیسے اصول اپنانے پر ابھارتا ہے۔ خواہشات کو دبانا، اسراف سے بچنا، مسابقت میں نہ پڑنا، فساد نہ پھیلانا، نمائش سے گریز، انا کی سرکوبی فلاح کے لئے اہم ہیں۔۔۔''(۱۴)

مگر جیسے ہی امریکی قوم نے فتح مندی حاصل کی انہوں نے پوری دنیا پر اپنا تسلط مستحکم کرنے کے لئے اور خصوصاً ترقی پذیر ممالک پر اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کی خاطر معاشی ترقی کے اصول بدل ڈالے۔ کیونکہ ان کے نزدیک ترقی کا معیار دنیاوی مال و دولت اور شان و شوکت سے متعلقہ ہے۔ جس کے باعث دنیا میں ہر طرف افراتفری، بے سکونی، بے اطمینانی اور بے یقینی کی فضاء پھیل گئی ہے۔ ان سب کا سبب صرف یہی ہے کہ اہلِ مغرب نے مادی ترقی کے پیچھے پڑ کر تمام مذہبی، اخلاقی اور انسانی قدروں کو نہ صرف یہ کہ خود سے خارج کر دیا بلکہ اپنی حاکمیت اور طاقت کے بل بوتے پر ساری دنیا کو ان سے عاری کر دیا ہے۔ اس سے سب سے زیادہ مسلمان متاثر ہوئے ہیں کیونکہ انہیں کے پاس وہ اصل قدریں تھیں جو انسانیت کے حامل تھیں۔

> ''آج کے زمانے میں معاشی ترقی کے لئے اصول ان کے برعکس ہیں۔ اسراف اس ترقی کا سنگِ بنیاد ہے۔ خواہشات کی کھڑکیاں ہمیشہ کھولی رہیں تو ترقی ہوتی ہے۔۔۔ انسان بے قرار نہ ہو تو ترقی نہیں کر سکتا۔ دوسروں کو مار گرانے کا جوڈو کراٹے نہ آئے تو آگے بڑھ نہیں سکتا۔ روپے سے محبت پیدا نہ ہو سکے تو ترقی کا تصور حاصل نہیں کر سکتا۔ اسراف، مسابقت، خواہشات کا پٹا تیزی سے چلے تو زمانے کی پٹڑی پر ترقی فل سپیڈ چلتی ہے۔''(۱۵)

ایک ملک کی حیثیت سے جہاں امریکہ بہت سے قدرتی وسائل کا مالک ہے، وہیں اس کے علمی، فنی اور

تکنیکی ارتقاء نے امریکہ کو دنیا میں ایک خصوصی اہمیت دلا دی ہے۔ بالخصوص متنوع کلچر اس کا خاصہ ہے جس پر امریکن اکثر فخر کرتے نظر آتے ہیں۔ اس تناظر میں امریکی مصنف اپنی کتاب Making American Culture میں لکھتا ہے کہ جنگِ عظیم اول کے بعد جب امریکن کلچر کو قبول کیا گیا تو یہ ایک قوم کی حیثیت سے ابھرا۔ امریکن کلچر کی خاص بات یہ ہے کہ اس کلچر میں بہت زیادہ تنوع یا ڈائیورسٹی ہونے کے باوجود یہ ایک دوسرے سے مختلف نہیں بلکہ ایک دوسرے سے یکجا نظر آتے ہیں۔(۱۶) لیکن دوسری طرف اب دنیا کی ایک بڑی قوت ہونے کے ناطے وہ ترقی پذیر ملکوں کو اپنا غلام بنانے کے لئے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے۔ کہیں قرضوں کے بوجھ تلے دبا کر انہیں اپنا محکوم بنانے کی کوشش کرتا ہے تو کہیں وہ اپنی تہذیب و ثقافت کی یلغار سے کمزور ملکوں کی اپنی تہذیب روایات کا جنازہ نکال دیتا ہے۔ امریکی حکومت ہمیں اپنا تابع مہمل بنا کر رکھنے کے لئے مخاصمت کی آخری حدوں تک جانے کو تیار ہے۔

> ”یہ تو ایسا دیس ہے جس کی وادیوں میں ندیاں جنگلوں میں دریا بہتے ہیں۔ سمندر سے جڑے پہاڑ اور میلوں لمبے ریتلے ساحل ہیں۔ یہ بڑے بڑے بزنس مین کا دیس ہے جس کے ایسے اکاؤنٹ ہیں جیسے کسی چھوٹے غیر ترقی یافتہ ملک کا بجٹ ہو۔۔“ (۱۷)

بانو قدسیہ نے اپنے ناول ”حاصل گھاٹ“ میں یہ دکھایا ہے کہ کمزور اقوام کو غلام بنانا اور لوٹنا مغربی اقوام یا تہذیب یا یوں کہیں کہ عالمگیریت کا شیوہ ہے۔ اور ان قوام کی بہت سی دولت لوٹ سے حاصل ہوئی ہے۔ مصنفہ کے نزدیک یقیناً امریکہ کی طاقت اور کامیابی کا ایک بڑا راز ان کے مضبوط معاشی ڈھانچہ اور جدید صنعتی سماج نے تشکیل دیا ہے جس نے ایشاء سمیت پوری دنیا پر گہرے اور دورس اثرات مرتب کرتے ہوئے سب کے دل موہ لئے ہیں۔ درحقیقت (عالمگیریت کی دلکشی یہی وہ سسٹم ہے) جو دنیا بھر کے افرادِ معاشرہ کو مغربی معاشرے کی نقالی اور خصوصاً غیر ملکی شہرت حاصل کرنے کی طرف رغبت دلاتے ہیں۔

> ”امریکہ نے اور ان کی دیکھا دیکھی تمام ترقی پذیر ممالک نے آزادی کے حق میں ووٹ دے دیا ہے۔۔۔ کرنے مرنے کی آزادی۔۔ ہر قسم کے تعلق سے نکل جانے کا عہد، اپنی ذات کو سربلند ثابت کرنے کا عزم۔“(۱۸)

بالعموم ہم جیسے غریب، پسماندہ، ترقی پذیر ممالک کا معیارِ زندگی اس قدر پست اور اقتصادی ترقی اس قدر سست ہے کہ ہماری عوام تنگ آ کر تلاشِ معاش کے سلسلے میں امریکہ میں قسمت آزمائی کے لئے جاتے ہیں

مگر ان کے جدید علوم وفنون اور جدید طرزِ معاشرت کی چکاچوند روشنیوں سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ اپنی تہذیبی روایات و اقدار تک کو بھلا بیٹھتے ہیں۔اور مغربی تہذیب کو مکمل طور پر اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

> ''امریکہ حیرت کے دریا کا وہ ساحل ہے جہاں کھڑے ہو کر پہلی بار انسان اپنے اندر تبدیلی محسوس کرتا ہے اور اس کی اپنی شناخت متزلزل ہوتی ہے۔ جس قدر کوئی حیران انگشت بدنداں ہو گا، اتنی ہی اس میں تبدیلی آئے گی۔ محیر العقول اشیاء کی سرعت سے بھرتی منڈی آپ کو دنگ کرتی ہے۔ بازار آپ کو گم کئے دیتے ہیں۔ ان کی سیر گویا ہر شہری کا جنت میں مفت داخلہ ہے۔ پھر یہاں کے نظام دھنگ کرتے ہیں۔ آہستہ آہستہ اکثریت گھیرے میں لے لیتی ہے اور نووارد حیرت زدہ پر رنگ چڑھنے لگتا ہے۔ کمزور اقلیت کے پاس دکھانے، سنانے، ابھارنے اور منوانے کے لئے کوئی چیز نہ تو وہ اکثریت کے بہاؤ میں ایسے ہی بہنے لگتی ہے جیسے دریا کے ریتلے ساحل'' (۱۹)

بد قسمتی سے آج پاکستانی قوم نے بھی ان کے جدید طرزِ زندگی اور مادی ترقی سے متاثر ہو کر اپنا رُخ امریکی قبلہ کی طرف موڑ لیا ہے۔ مثلاً ناول میں ہمایوں کے دونوں بچے جہانگیر اور ارجمند بھی اپنے بہتر مستقبل اور مادی ترقی کے حصول کے لئے اپنے ملک کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ کر امریکہ میں جا بستے ہیں۔ ان کے خیال میں انسان صرف اس دنیا میں دولت کمانے اور زیب و زیبائش کی زندگی گزارنے کے لئے آیا ہے۔ دراصل مصنفہ نے ارجمند اور جہانگیر کے کردار سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہم کس طرح مغربی تہذیب و ثقافت کے دلدادہ اور گرویدہ ہوتے جا رہے ہیں اور کس طرح اپنی تہذیب و تمدن سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ مصنفہ کے نزدیک حقیقت یہ ہے کہ ہماری تہذیب و ثقافت کا مقابلہ دنیا کی کوئی تہذیب نہیں کر سکتی۔

> ''میرے دونوں بچے امریکہ جا چکے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ انسان اس دنیا میں صرف دولت کمانے کے لئے آیا ہے، امریکہ کی بھیڑ میں گم ہوتے انہیں دیر نہ لگتی کیونکہ وہ فلاح کے گاہک نہ تھے اور دولت کے بغیر زندہ رہنے کو ننگِ زندگی سمجھتے تھے۔ انہوں نے ترقی کی دیوی کے آگے سر جھکا دیا تھا۔'' (۲۰)

عالمگیریت کا ایک ثمر یہ بھی ہے کہ امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ دولت کا ارتکاز سکڑ کر چند ہاتھوں میں ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اب چونکہ مغرب اور خصوصاً امریکہ خود عالمگیریت کا علمبردار

ہے اس لئے وہاں کی اکثریت چھوٹے موٹے کاموں کے لئے خود خوار ہونا پسند نہیں کرتی بلکہ اس کے لئے وہ پسماندہ ممالک خصوصا ایشیا سے محنت کش طبقے کو اپنے ہاں پیسے کا لالچ اور انسانی حقوق کے سہانے خواب دکھا کر بلا لیتے ہیں۔ اب چونکہ اپنے اصولوں کا دکھاوا کرنا بھی مقصود ہوتا ہے تاکہ یہ پسماندہ طبقہ، جو ایک اقلیت کی صورت میں رہتے ہیں، کہیں واپسی نہ بھاگ جائے اور ہمیں یہ کام نہ کرنا پڑیں اس لئے وہ اس اقلیت کو حتیٰ المقدور خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ عالمگیریت کا اونٹ انہی محنت کشوں کی رسیوں میں بندھا ہوا ہے۔

"اقلیتیں چونکہ ان کی معیشت کی ضرورت ہیں اور ان اقلیتوں کے بغیر امریکہ کی خوشحالی آگے نہیں بڑھ سکتی، اس لئے وہ ہر ممکن طریق سے اکثریت کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اقلیت کو راضی رکھو۔ اس کم اجرتی محنتی طبقے کے بغیر ہم ساری دنیا پر راج نہیں کر سکتے۔"(۲۱)

اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اقلیت یعنی تارکین وطن محنت کش طبقہ اپنے حالات کو پسماندہ ممالک کے حال سے بہتر جان کر خوش ہوتا رہتا ہے۔ حالانکہ وہ دل سے کبھی اپنی حالت پر خوش نہیں ہوتے اور نہ ہی نئی ثقافت سے خود کو جوڑ پاتے ہیں۔ مگر دولت آتی دیکھ کر ان کا وطن واپس جانا محال سے محال تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں کہ عالمگیریت پذیر معاشرے میں وہ صرف گھوڑے گدھوں کی طرح ہانکے چلے جا رہے ہیں۔ عالمگیریت کا معاشی ڈھانچہ اپنے ثمرات اپنی عوام اور مخصوص ملٹی نیشنل کمپنیوں کو دیتا ہے۔ یہ تو بس مزدور ہوتے ہیں جو چار پیسے دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوتے رہتے ہیں۔ وہ سہانے خواب جو وہ خود کو اور اپنی اولادوں کو دکھاتے ہیں وہ کبھی پورے نہیں ہوتے۔ نتیجتاً سال کے سال گزرتا چلا جاتا ہے مگر عالمگیریت انہیں اندر ہی اندر سے کھاتی چلی جاتی ہے۔ وہ نہ مغرب میں اپنی پہچان بنا پاتے ہیں اور نہ ہی واپسی اپنے اوطان کو لوٹ پاتے ہیں۔

"بات یہ ہے چاچا جی۔۔۔ کہ دس سال سے یہاں رہنے کے بعد بھی یہاں کی سوسائٹی میں دل نہیں لگا۔ حسن تو چاہتے ہیں کہ واپس چلے جائیں لیکن بچے رضامند نہیں ہوتے۔۔۔ جب ہم یہاں آئے تھے تو ہمارا خیال تھا کہ یہ جلاوطنی چند سال کی ہے لیکن پھر یہاں کی زندگی دلدل بن گئی۔ روزی کمانے آئے تھے۔ اب یہاں کے ہی ہو رہے ہیں۔ کچھ سمجھ نہیں آتا۔۔۔ کیا کریں چاچا جی۔ وطن بھولتا نہیں اور تن آسانی واپس جانے نہیں دیتی۔"(۲۲)

عالمگیریت کا سماجی و معاشی بت ایسا پر کشش ہے کہ اس سے صرف محنت کش طبقہ ہی مغرب نہیں چلا آتا، بلکہ اچھے خاص امیر اور کھاتے پیتے گھرانوں کے خانوادے بھی عالمگیریت کے سحر میں جھکڑے امریکہ یا مغربی ممالک میں دوڑے چلے آتے ہیں۔ وہ نہ اپنی عزت کا خیال کرتے ہیں اور نہ ہی اپنی خاندانی جاہ و حشمت کو خاطر میں لاتے ہیں۔ عالمگیریت انہیں ایسے سہانے خوابوں کا لالچ دیتا ہے کہ وہ اس کے لئے ہر چیز کی قربانی دینے کو آمادہ نظر آتے ہیں۔ یہاں وارد ہو کر ان پر مغرب کی اصل حقیقت آشکار ہوتی ہے، لیکن تب تک بہت دیر ہو گئی ہے۔ شرمندگی کی وجہ سے وہ نہ واپسی جا پاتے ہیں اور نہ ہی انہیں مغرب ان کا اصلی مقام دیتا ہے۔ جس معاشرے کو وہ پھولوں کی سیج سمجھ کر دوڑے آئے تھے وہی ان کے لئے گلے کا پھندہ بن جاتا ہے۔

> ”میرے میاں ان کے یہاں آنے پر رضامند نہ تھے۔ ہم لوگ پیچھے سے بڑے سوکھے ہیں چاچاجی، دو پلازا تو گلبرگ میں ہیں۔ اندرونِ شہر بھی پراپرٹی ہے۔ شیخ جی کہتے تھے کہ تم کو باہر جا کر کیا ملے گا۔ دھکے محنت مزدوری، بھانڈے کپڑے دھونا، آرام سے رہو۔۔۔۔ جیسے سارے خاندان کے لوگ رہتے ہیں۔ پھر ان لوگوں کے دوست یہاں آ گئے۔۔۔ سکندر کو تو ڈھنگ کا کام بھی نہیں ملا، لیکن وہ واپس نہیں جاتا۔ اس کا ابھی تک گرین کارڈ نہیں بن سکا اور وہ کبھی ایک وکیل پکڑتا ہے کبھی دوسرا۔ آج کل وہ ایک پیپر میرج کے چکر میں ہے۔“(۲۳)

معاشیات عالمگیریت کا محض ایک روپ ہے۔ اس کے علاوہ اس کے کئی چہرے ہیں جس کی نت نئی صورتیں ہمیں روز دیکھنے کو ملتی ہیں۔ عالمگیریت کا منہ زور گھوڑا اب سماجی و ثقافتی رنگ میں بھی نمایاں صورت اختیار کر گیا ہے۔ ہماری اقدار مغرب سے بالکل جدا تھیں۔ ہمارے ہاں بڑوں کا ادب و احترام اور دوسروں کا لحاظ واضح طور پر موجود تھا۔ ہمارا لباس نہ صرف ننگ ڈھانکتا تھا بلکہ شرم و حیا کے تمام تقاضوں کو بھی ملحوظ خاطر لاتا تھا، لیکن اب مغربی لباس ہمارے ہاں عام صورت میں مقبولیت کا درجہ پا چکا ہے۔ ایک وقت تھا کہ ہمارے معاشرے میں ذہین و عقلمند لوگوں کی قدر کی جاتی تھی، ان کا معاشرے میں ایک نمایاں مقام تھا، لوگ ان کی بات سنتے اور قدر کرتے تھے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ عالمگیریت نے ہمارے روشن دماغوں کو اپنی طرف راغب کرنا شروع کر دیا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ ہر اچھا طالب علم یورپ بھاگنے کے چکر میں نظر آتا ہے۔ کیا پاکستانی، ایرانی، افغانی، ہندوستانی و چینی سب امریکہ امریکہ کا راگ الاپ رہے ہیں۔ یہ سب چیزیں ہمارے سماج کو اندر سے کھوکھلا کر رہی ہیں، لیکن پورا معاشرہ کبوتر کی طرح آنکھیں موندے سمجھ رہا ہے کہ ہنوز خطرہ

بہت دور ہے۔ آج امریکہ کی نقالی ہی مستند مانی و سمجھی جاتی ہے۔

> ”اب امریکن یونیورسٹیوں ، بازاروں دفاتر ، غرضیکہ سارے شعبہ ہائے داروسن میں تارکینِ وطن کا ایک ریلا بہہ رہا ہے۔ چینی، ہندستانی، جاپانی، پاکستانی، عربی، حتیٰ کہ یورپی جو مدتوں اپنی شناخت پر نازاں رہے، اپنے آبائی لباس چھوڑ کر جینز بنیان میں ملبوس امریکنوں کے نقال بننے میں فخر محسوس کر رہے تھے۔“(۲۴)

امریکہ میں ہجرت کرنے والوں میں ایک غالب اکثریت طلبا کی ہوتی ہے لیکن یہ تعداد صرف طلبا یا اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے آنے والوں ہی کی نہیں بلکہ امریکہ آنے والے تارکین میں ہر طبقے کے لوگ شامل ہیں۔پاکستان چونکہ ایک ترقی پذیر ملک ہے اس لئے یہاں کے مسائل بھی مختلف نوعیت کے ہیں۔ہمارے ہاں سیاست میں کسی سے بدلہ مقصود ہو تو اس پر اقتدار میں آتے ہی کیسز بنائے جاتے ہیں۔انہیں مجبور کیا جاتا ہے کہ یا وہ اپنی سیاسی سرگرمیاں چھوڑ دیں یا ملک کو خیر آباد کہہ دیں۔ایسے میں بہت سے سیاستدان پناہ کی تلاش میں مغربی ممالک آتے ہیں۔

اسی طرح ہمارے جیسے ترقی پذیر ممالک میں مذہب کے نام پر اقلیتوں سے بے جا ناروا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ایسے میں شدت پسندوں سے گھبرائے ہوئے افراد اپنی جان بچانے کے لئے بھی امریکہ کا سہارا لیتے ہیں۔بہت سی اور پریشانیاں بھی ہوتی ہیں جس کی وجہ سے لوگ مغرب میں پناہ کی تلاش میں آتے ہیں۔ مگر یہ سب تو ضرورت مند ہوتے ہیں اور امریکہ ان کی ضرورت کو پورا بھی کرتا ہے مگر ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو صرف شوق کی تسکین کی خاطر امریکہ یا مغرب میں دوڑے چلے جاتے ہیں۔ بعض احباب کے مدنظر اچھی اور پُرسکون زندگی کا حصول ہوتا ہے۔اس طرح سے اور بھی بہت سے افراد ہیں جو مختلف وجوہات کی بنا پر امریکہ وارد ہوتے ہیں۔بنیادی طور پر یہ عالمگیریت کا سنہرا پنجرہ ہے، جس میں قید ہونے کے لئے دور نزدیک سے لوگ بخوشی وبرضا ورغبت تشریف لاتے ہیں۔اس صورتحال کی عکاسی بانو قدسیہ نے ان الفاظ میں کی ہے:

> ”کچھ تارکین اللہ کا فضل تلاش کرنے نئے ملک میں وارد ہوتے ہیں۔۔۔کچھ اپنے وطن کی سہ گیریوں سے پریشان ہو کر سیاسی پناہ گزین بنتے ہیں۔اپنے ملک میں عزتِ نفس کی کمی کے باعث انہیں پردیس کی مشقتوں کو اپنانا پڑتا ہے ۔۔۔ بعض رہائش ، آسائش ، زیبائش کی

خاطر نئے دیس کو اختیار کرتے ہیں۔ کچھ تبدیلی کو انسانی زندگی کی روح سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو نئے Exposure کے حوالے کر دیتے ہیں۔ کچھ ہجرت سے ناواقف وطن سے خوفزدہ ہو کر صرف بھیڑ چال کے نرغے میں آکر امریکہ میں منہ اٹھائے پھرتے ہیں۔ بعض خود رائی کے شوقین روک ٹوک سے گھبرا کر امریکی جنت میں پناہ لیتے ہیں۔ کچھ سمجھتے ہیں کہ تعلیم ہی فلاح کا واحد راستہ ہے اور اس کے بغیر ترقی ممکن نہیں۔۔۔ تعلیم کے پیچھے سرگردان لوگوں کی تعداد امریکہ میں زیادہ ہے۔۔۔"(۲۵)

ہماری نوجوان نسل آج گہرائی سے چیزوں کا مشاہدہ کرنے سے قاصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصنفہ قاری کو سمجھانے کے منصب پر براجمان نظر آتی ہے۔ دنیا کے اکثر ممالک اور معاشرے کلچر و ثقافت کی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں اور مستقبل کی راہ اسی کی روشنی میں متعین کرتے ہیں لیکن امریکی معاشرے کے متعلق یہ چیز یاد رکھنے کے لائق ہے کہ امریکی معاشرہ بغیر کسی ثقافت کے آگے بڑھ رہا ہے۔ وہ آگے بڑھنے کے لئے سیاست، جمہوریت اور آئین و قانون کا سہارا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں اقدار متعین یا محفوظ نہیں کرنی پڑتیں۔ جمہوریت میں اکثریت کی بات ہی کلچر یا ثقافت کا رنگ وروپ اختیار کر لیتی ہے۔

یہی وجہ ہے امریکی معاشرے میں سماجی حوالے سے اقدار کا فقدان ہے۔ وہ جس چیز پر بحیثیت اکثریت یقین کر لیتے ہیں اسے ہی رائج کر لیتے ہیں۔ ایسے میں اقلیت چونکہ تعداد میں کم ہوتی ہے اس لئے وہ اپنی بات کو منوا نہیں پاتی اور خاموشی سے بھیڑ چال کی طرح سر جھکائے بات مانتی چلی جاتی ہے اور اپنی جڑوں سے دور ہوتی جاتی ہے۔

"جمہوریت میں اکثریت من حیث القوم جو کچھ بھی کرتی ہے، اصول ٹھہرتا ہے۔ لباس اتار دے، برہنہ پن اصول۔ لباس پہن لے، یہی پہناوا دل پسند۔۔۔ ایک شادی رائج کر دے تو مونوگیمی اصول۔۔۔۔ بے شمار شادیوں کو رائج کر دے یہی معیار۔۔۔ سب کی رائے سے حکومت چلائے درست۔۔۔ اکثریت کسی کی نہ سنے اور آمریت کا ہی سونٹا کھڑکائے تو آمریت ہی من چاہا طریقہ۔ اکثریت کے رسم ورواج، کلچر حکومت، سیاست ہی سب کو پسند آئے۔ معیشت کی بانٹ میں منطق ہو یا نہ ہو اکثریت کا بہاؤ ضرور شامل ہوتا ہے۔ اکثریت اپنے دیس میں لوہا منوا لینے کی حیثیت میں ہوتی ہے اور ڈھرلے کی زندگی بسر کرتی ہے۔ رائے عامہ کا بل ڈوزر سب کچھ ہموار کئے جاتا ہے۔" (۲۶)

لیکن مصنفہ کا اس ضمن میں نقطہ نظر یہ ہے کہ اقلیت جتنی مرضی کوشش کر لے وہ اکثریتی سماج میں کبھی مدغم نہیں ہو سکتی۔ اس کے اور مغربی سماج کے بیچ ہمیشہ ایک پردہ حائل رہتا ہے۔ وہ اپنی کوشش کرتے ہیں کہ دولت کے زور پر اس پردے کو بیچ سے اٹھا سکیں لیکن اس میں ناکام رہتے ہیں۔ یوں آہستہ آہستہ انہیں اپنے سماج، اپنے معاشرے، اپنی روایات و اقدار کا خیال آتا جاتا ہے۔ ہر وقت ان میں بے چینی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہ نہیں کہ وہ معاشرے میں مدغم ہونا نہیں چاہتے، وہ معاشرے کو قبول کرنا چاہتے ہیں لیکن ایک تو خود معاشرہ ان کو گھاس نہیں ڈالتا دوسرا اہم نکتہ اس ضمن میں یہ ہے کہ ثقافت برسوں کی ریاضت کے بعد نسل در نسل پروان چڑھتی ہے، ایسے میں ثقافت سے فوراً قطع تعلق نہیں کیا جا سکتا، نہ ہی ایک دم سے دوسرے سماج کو قبول کیا جا سکتا ہے۔ ایسے میں جب مایوسی اقلیت کا دامن گھیرنے لگتی ہے تو لا محالہ اسے اپنی ثقافت اچھی لگنے لگتی ہے اور طوعاً و کرہاً وہ اسے قبول کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔

> ”جوں جوں انسان اپنی کمی کو زیادہ محسوس کرتا ہے، اس کا رجوع دولت کی طرف تیزی سے ہوتا ہے۔ دولت وہ زبردست مور پنکھ ہیں جس سے بیچارہ کوا ہنس بننے کے آخری خواب دیکھتا ہے۔۔۔ فرد کی حد تک تو دولت کا نسخہ کافی کامیاب رہتا ہے، کار، بنک بیلنس، کوٹھی، ہوائی سفر، دبدبہ، فرعونیت۔۔۔ لیکن عموماً دولت اقلیت کا مسئلہ مجموعی طور پر حل نہیں کر سکتی۔ جب اقلیت ضم ہونے کی تمام تراکیب استعمال کر چکتی ہے اور کامیاب نہیں ہو پاتی۔ جب چینی پانی میں اور زیادہ حل نہیں ہو سکتی تو ایک بار پھر محلول سوکھنے لگتا ہے۔ چینی علیحدہ ہو کر Crystals کی شکل اختیار کرنے پر مجبور ہے۔“(۲۷)

پس حاصل گھاٹ میں مصنفہ نے عالمگیریت کے معاشی و سماجی غلبے کو تفصیل سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور پس ماندہ اقوام پر اس کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے عالمگیریت نے معاشی حوالے سے پوری دنیا کو اپنے زیر نگین کیا ہوا ہے اور صرف معاشی ہی نہیں بلکہ سماجی طور پر دنیا پر ایک سحر طاری کیا ہوا ہے۔ آج کی نوجوان نسل اس سماجی سحر کے خمار میں گرفتار ہے، ہنوز جس سے نکلنے اور اپنی ثقافت سے جڑنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔

ب۔ اخلاقی جہات اور مذہبی تناظر:

دنیا کی غالب اکثریت کسی نہ کسی حوالے سے مذہب سے وابستہ ہے۔ مذہبی وابستگی نبیوں، اوتاروں،

بکھشوؤں، پنڈتوں، مسجدوں، مندروں، عبادت گاہوں غرض کسی بھی رنگ میں نظر آسکتی ہے۔ مذہب ایک ضابطہ حیات ہے، یہی وجہ ہے کہ مذہب کوئی بھی ہو اس میں اخلاقیات کا بہت عمل دخل ہے۔ گویا کہ اخلاق مذہب کا لازمہ محض ہے۔ جہاں مذہب ہو گا وہیں بعض اچھی باتوں کی تلقین اور بعض بری باتوں کی مناہی پائی جائے گی۔ مذہبی لحاظ سے مشرق ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی ایک وجہ اسلام کی ابتدا اور اس کی عالمگیر تعلیم کا مؤثر نفوذ ہے۔ دوسرا یہاں کی غالب اکثریت یا یوں کہیں کہ تقریباً ساری آبادی کسی نہ کسی رنگ میں مذہب سے وابستہ ہے۔ مشرقی کلچر میں مذہب کی واضح چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ خصوصاً پاکستانیوں کی تو اہم ترین پہچان ہی اسلام ہے۔ وہ ذات پات، رنگ و نسل کے امتیاز کو نسبتاً بہت کم اہمیت دیتے ہیں۔

چنانچہ مشرقی ثقافت معاصر اسلامی تہذیب کا حصہ ہے۔ جس کی اقدار و روایات اسلام اور تابندہ اسلامی تاریخ سے اخذ ہوئی ہے۔ مشرق کی اکثریتی آبادی بھی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ جو ایک اللہ کی واحدانیت اور محمدؐ کی رسالت پر ایمان رکھتی ہے۔ یوں مشرقی ثقافت اسلامی اقدار سے جڑی ہوئی ثقافت ہے۔ اس لئے مشرقی ثقافت کی اکثریتی آبادی مذہب کو ایک اکائی نہیں بلکہ کُل مانتی ہے۔ اور ان کے نزدیک مذہب ہر چیز پر حاوی ہے جس کے باعث ان کی ہر چیز پر مذہب کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے ہاں یہ دنیا فانی ہے، جس سے دل لگانا مستحسن نہیں ہے بلکہ دنیا سے زیادہ آخرت کی فکر رکھتے ہیں۔ یہ معاشرتی، روحانی اور اخلاقی اقدار کی پاسداری کی وجہ سے بے مثال ہے۔ جس میں اسلامی زندگی اور اسلامی اقدار کا تحفظ بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

> ”مشرق میں ابھی تبدیلی سے اتنی محبت پیدا نہیں ہوئی۔ تبدیلی ہمیں خوفزدہ کرتی ہے۔۔۔ ہم صابرین اور شاکرین میں سے ہونا چاہتے ہیں۔ ہم مابعد اور آخرت میں اپنا حصہ لینا چاہتے ہیں۔ یہی وہ بنیادی فرق ہے جس کے باعث پھر کہنا پڑتا ہے کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب اور یہ دونوں کبھی مل بھی نہیں سکتے۔“(۲۸)

مشرقی لوگ مذہب کو زندگی کے دائرے سے الگ نہیں سمجھتے کیونکہ ان کے نزدیک مذہب ہی معاشرے کا تانا بانا ہے۔ کسی معاشرے کی پہچان مذہب ہی سے ہوتی ہے۔ ان کے خیال میں مذہب کو چھوڑ دینا اس کے معاشرے کو خیرباد کہنے کے مترادف ہوتا ہے جو کہ ان کے لئے بہت مشکل کام ہے۔ مصنفہ کے نزدیک مذہب انسان کو خاندان اور معاشرے کی پہچان عطا کرتا ہے۔ خدائے واحد کے ماننے والے تمام دنیوی طاقتوں کی نفی کرتے ہیں اور سوائے خالقِ حقیقی کے کسی کے آگے سر نہیں جھکاتے۔ وہ مذہب کے نام پر قربانی دینے کو بہادری، شجاعت اور دلیری کی

علامت سمجھتے ہیں۔ المختصر مذہب تحفظ کا احساس مہیا کرتا ہے نیز مشرق کے نزدیک مذہب دینی اور دنیاوی ہر دو اعتبار سے فلاح کا ضامن ہے۔

> "دیکھ لو کسی سے کم نہیں۔۔۔ آرام دہ گھر ہے۔۔۔ تعلیم یافتہ بیٹا بیٹی ہے۔۔۔ اللہ رسول کا نام ہے اور کسی کو کیا چاہیے۔۔۔ دنیا بھی ملی اور دین بھی، ترقی بھی ملی اور فلاح بھی۔ ہمارے نبیؐ تو دو جہاں کے بادشاہ ہیں، ہمیں بھی دونوں جہان دلواتے ہیں۔۔۔"(۲۹)

اس کے بالمقابل مغرب ایک بالکل متضاد خصوصیات کا حامل معاشرہ ہے۔ یہاں مذہب کلچر کا کل نہیں بلکہ اس کا ایک جزو ٹھہرتا ہے۔ مذہب کی کارفرمائی انسان کی ذاتیات تک محدود ہے۔ نہ ریاست سے مذہب کا کوئی تعلق ہے نہ ہی کوئی مذہبی حوالے سے کسی دوسرے کو فورس کر سکتا ہے۔ پاکستان میں غالب اکثریت مسلمان ہیں اور پاکستان حاصل بھی اسلام کے نام پر کیا گیا تھا اس لئے یہاں مذہب کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے بالمقابل امریکہ میں متنوع ثقافتیں اور مذاہب موجود ہیں۔ اسی وجہ سے یہاں ریاست نے مذہب کو فرد کا ذاتی مسئلہ قرار دے کر سب کے حقوق خود متعین کر کے اسے ہیومن رائٹس کا نام دے دیا ہے۔

> "امریکہ میں نبیوں کا بنایا ہوا نظام نہیں چلتا، کیونکہ یہاں بہت سی قومیں، مذاہب نسلیں مستقلاً ایک دوسرے سے بھڑتی رہتی ہے۔ جھگڑے اور تصادم سے بچنے کے لئے اور اکثریت کی خواہشات کو مدنظر رکھ کر امریکی شہریت کو ذاتی لاکر میں بند کر کے ہیومن رائیٹرز کا کریڈٹ کارڈ استعمال کرتا ہے۔"(۳۰)

علاوہ ازیں امریکہ سرمایہ داری اور عالمگیریت کا علمبردار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ سمیت پورے مغرب میں انسان کو ایک مشین یا سرمایے کی طرح برتا جاتا ہے۔ ایسے میں کہنا بجا ٹھہرتا ہے کہ "نئے سرمایہ دارانہ سماج نے مذہبی تصورات کو بھی بے حد متاثر کیا ہے۔(۳۱) ایسے میں مذہب کی عمل داری میں واضح کمی آئی ہے۔ امریکہ میں تو گویا کام ہی خدا ہے اور کام ہی نبیوں کی تعلیم گردانی جاتی ہے۔ یہ مشینی دور ہے، اس میں مذہب پر عمل کرنا، یعنی ایک خیالی دنیا میں جینا حماقت یا وقت کا ضیاع سمجھا جاتا ہے۔ ان کا مذہب ان کا کام اور کام سے جڑی اخلاقیات ہیں۔ اس معاملے میں نہ ریاست کوئی کمی کرتی ہے نہ ہی کوئی فرد سستی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جیسے مشرق میں انسان مذہب کے ساتھ بظاہر مخلص ہے ایسے ہی مغرب میں انسان اپنے کام کے ساتھ

مخلص ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جیسے مذہب میں عیدوں یا کرسمس وغیرہ کا تصور ہے تا کہ انسان کھائے پیے اور خوشی منائے ایسے ہی مغرب میں ویکنڈ کا تصور ہے۔ایک انسان پورا ہفتہ تندہی سے کام بجالائے گا اور پھر ویکنڈ پر اپنی ساری مصروفیت کا بوجھ اتار پھینکے گا۔

> ''مغربی لوگوں کا خدا کام ہے۔۔۔۔ہر تیسرا آدمی Workaholic ہے۔اس کی اخلاقیات میں سرفہرست محنت کی اخلاقی قدر ہے۔ وہ کام میں چوری نہیں کرتا۔ اپنے Employees کا وقت ضائع نہیں کرتا۔ Work ethics نے اسے مشینی بننے میں مدد دی ہے،اسی لئے بالآخر اُسے کام سے بریک درکار ہوتی ہے اور وہ پورے پانچ دن مشین بنا ویک اینڈ کا انتظار کرتا رہتا ہے جب اس کے جسم کو تفریح اور آرام کی گریس دی جاسکے۔''(۳۲)

یہی وجہ ہے کہ سارے امریکہ میں کام،کام اور صرف کام کو اہمیت دی جاتی ہے۔مشرق میں کوئی بھی کام ہو اگر اس میں نماز کا وقت آجائے یا کوئی جنازہ یا کوئی اور مذہبی مصروفیت آجائے تو پہلے اسے فوقیت دی جاتی ہے۔یہاں کہا جاتا ہے کہ کام جائے بھاڑ میں پہلے نماز ضروری ہے۔کیونکہ ہمیں آخرت سنوارنے کا حکم ہے۔اس کے بالمقابل مغرب کی ترقی کا راز ہی صرف کام ہے۔کام کے لئے وہ انتھک محنت کرتے ہیں۔محنت کی عظمت سے آج وہ اس مقام پر پہنچیں ہیں۔باقی بیشک ساری اخلاقیات میں ان کا جنازہ نکل جائے محنت اور کام کے معاملے میں وہ کسی سمجھوتے پر اتفاق نہیں کرتے۔ہمارے پاس گپ شپ کے لئے خاندان ہوتا ہے،بلکہ ہم تو کام کے دوران بھی ان سے بات کرلیتے ہیں لیکن مغرب میں کام کے دوران کسی اور کام کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔پورے صدق دل اور ایمانداری سے وہ اپنے کام کو بجالاتے ہیں اور خاندان کی بجائے ان کا رشتہ بھی کام سے ہی جڑ جاتا ہے۔

> ''دراصل امریکہ میں ساری اخلاقیات کام کی اخلاقیات کے بعد آتی ہیں۔اس معاشرے میں اسی انسان کی عزت ہوتی ہے جو کام میں پورا اترتا ہے۔سب کا رشتہ کام سے گہرا ہے اور فرد کا فرد سے رشتہ ناطہ ذاتی اغراض کے باعث نہیں بلکہ ذاتی خوشی پر منحصر ہے۔ یہاں سب کام کی اہمیت کے لئے جڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔''(۳۳)

کام سے محبت، محنت کے علاوہ ان کے ہاں وقت کی پابندی کا وصف بھی نمایاں ہے۔یہی عالمگیریت کا خاصہ ہے،وہ اسی غرض سے انسان سے مذہب کا لبادہ اتروادیتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اتنی متنوع ثقافت میں

مذہب کی کار فرمائی لڑائیوں کا موجب ہی بنے گی۔اسی لئے اس کے ہاں ہر انسان کے کچھ حقوق ہیں جن پر سختی سے عملدر آمد کروایا جاتا ہے۔ان حقوق کے بدلے ان سے بے پناہ کام لیا جاتا ہے،خدمت کروائی جاتی ہے،اندھی تقلید مشرق میں مذہب کی ہے ،مغرب میں وہی کام کی ہے۔کام سے انسان کو مشینی بنا دیا جاتا ہے۔جس طرح مذہب انسان سے سوچنے سمجھنے کی قوت صلب کر لیتا ہے،ایمان غیب پر آنکھیں بند کر کے یقین کرنے کا نام ہے ایسے ہی مغرب میں کام پر آنکھیں بند کر کے یقین کیا جاتا ہے،کام کے ذریعے ان سے سوچنے سمجھنے کی قوت صلب کر لی جاتی ہے۔مشرق میں مذہب آپ سے بری اقدار اور رسم ورواج چھڑوا دیتا ہے،ایسے ہی مغرب میں کام اور محنت کی بدولت آپ سے رشتے،اقدار اور رسم و رواج سب پیچھے رہ جاتے ہیں۔

> ”نئی ترقی کے پاس وہ بل ڈوزر ہے جو مذہبی باڑھوں کو اکھاڑ تا پچھاڑ تا ہموار کرتا چلا جاتا ہے۔ صرف محنت کا عزم اور کام کی اخلاقیات کے رولز پکڑا کر اپنا راستہ سیدھا کر لیتا ہے اور نئی سڑکوں پر ہیومن رائٹس کی کولتار بچھا کر انسان کو جس قدر زیادہ مشینی اور وقت کا پابند بنا سکے ، بنا ڈالتا ہے۔اس بل ڈوزر تلے کیا کچھ پس جاتا ہے اس کی پروا نہیں۔ اقدار ، رسم ورواج، مذہب کے پھول اکھاڑ کر وہ گھاں گھاں کرتا آگے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔“(۳۴)

مغرب نے انہیں اقدار اور اخلاقیات کے سر پر ترقی کی ہے اور مشرق انہیں اقدار اوراخلاقیات کی عدم موجودگی کی بدولت پیچھے رہ گیا ہے۔مغرب میں کام کے دوران کسی اور سرگرمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔سب اپنے کام سے مخلص ہیں،حالانکہ ان کے نزدیک انہیں کوئی ہر وقت دیکھنے والا خدا بھی نہیں ہوتا پھر بھی وہ سب کام میں جتے رہتے ہیں۔مشرق میں اس کے الٹ کام ہے۔یہاں مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اللہ ان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اور وہ ہر امر کی نگرانی کر رہا ہے پھر بھی ہم اللہ کی بتائی ہوئی تعلیمات کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ہم جان بوجھ کر منافقت کرتے ہیں۔ڈنگ ٹپاؤ کام کرنے کی ہمیں بچپن سے عادت ہے۔انگریز کام کے دوران ایک سیکنڈ کی بریک یا وقفہ نہیں کرتے جبکہ ہم کام کے لئے بریک کرتے ہیں ورنہ تو ہر وقت ہم فری ہی ہوتے ہیں۔کام سے ہمارا ہر فرد دل چراتا ہے۔چھوٹے چھوٹے بہانے بنا کر کام سے چھٹی کر لیتا ہے۔ اسلام کی بنیادی تعلیم صفائی ہے،نصف ایمان صفائی ہے۔آپ باقی آدھے ایمان کا اندازہ صفائی کے معیار سے ہی لگا سکتے ہیں۔

مغرب میں صفائی اپنا فرض سمجھ کر کی جاتی ہے،اسے حکومتوں کی ذمہ داری نہیں سمجھا جاتا۔ کچرا، کچرے دان میں ڈالیں گے، کہیں تھوکیں گے نہیں، پانی کی کیاریاں صاف رہیں گی۔ کہیں گرد یا کچرے کا نام و نشان نہ ملے گا۔اس کے بالمقابل مشرق میں صفائی کا ذمہ ہم نے حکومتوں پر دھرا ہوا ہے۔ ہر گھر کے باہر کچرا پڑا ہو گا جو خاکروب کے اٹھانے پر چھوڑ دیا جائے گا۔ چلتی گاڑی سے گند باہر روڈ پر پھینک دیا جائے گا، جبکہ کہنے کو ہم بڑی متمدن قوم کا راگ الاپیں گے۔

”جرمن ٹاون کے اس محلے میں صفائی، ستھرائی کا یہ عالم ہے کہ کبھی کسی کھڑکی، دیوار، پکی پگڈنڈی پر کاغذ، مٹی، گھاس کا تنکا بھی نظر نہ آیا۔ میں بیلکونی میں بیٹھ کر سڑک کا نظارہ کرتا رہتا۔ ہر پیر اور ہفتے کے روز گند گاڑی آتی۔ اس میں بڑے مضبوط جسموں والے نیلی وردیاں پہنے نیگرو، امریکن اور دوسرے تارکینِ وطن باہر نکلتے اور گھروں سے باہر رکھے ہوئے پلاسٹک کے کالے ڈرموں میں سے کوڑا کرکٹ اٹھا کر لے جاتے۔ نہ سگریٹ پینے کے بہانے بیٹھتے، نہ ہی کسی دوسرے پر کام چھوڑ کر خود چمپت ہو جاتے۔ ہمارے دیس میں عام طور پر نماز پڑھنے کے بہانے کارندے جاتے ہیں اور پھر لوٹ کر آفس میں واپس نہیں آتے۔ جمعے کے روز تو معمول ہوتا کہ گو دفتر پانچ بجے تک کھلیں لیکن واپسی کی نفری ضرور کم ہو جاتی۔“(۳۵)

یہ صرف ایک دو مثالیں ہیں جن کا مصنفہ نے ذکر کیا ہے ورنہ ہمارے معاشرے میں موجود برائیوں کا مصنفہ نے جابجا ذکر کیا ہے۔ مصنفہ کا کمال یہ ہے کہ انہیں غیر جانبدارانہ طریقے سے جس ثقافت میں جو خوبی دیکھی اس کی کھل کر تعریف کی، ساتھ ہی ساتھ برائیوں کو برا کہنے سے بھی نہیں ہچکچائیں۔ مصنفہ کے نزدیک کام سے ایمانداری تو ہمیں اسلام میں سکھائی گئی تھی لیکن اس کی حقیقی شکل ہمیں مغرب میں نظر آتی ہے۔ ہمیں اسلام نے جھوٹ، کام چوری، سفارش، رشوت، بد دیانتی وغیرہ سے منع کیا اور اس کی بہت سخت وعید بھی سنائی، لیکن ہم نے اس پر کان نہیں دھرے۔ اس کے بالمقابل مغرب، جن پر کہ کوئی مذہبی دباؤ بھی نہیں ہے، وہ ہم سے زیادہ ان اصولوں پر عمل پیرا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی کی دیوی ان پر مہربان ہے۔ وہ ترقی کے اعتبار سے آج کے ہمارے مشرقی معاشرے سے تقریباً پچاس سال آگے ہیں۔ مصنفہ، ہمایوں کے کردار کے ذریعے اس کا اظہار کچھ یوں کرتی ہیں:

”سوچتا ہوں امریکی لوگ اپنے اپنے کام اتنی چستی سے کیسے کر لیتے ہیں؟ کیا اس کے پیچھے ان

کی Work Ethics ہے ؟ کیا اس کا تعلق موسم سے ہے ؟ کیا سفید فام لوگ قدرتی طور پر رزق حلال کمانے کے شوقین ہیں ؟ کیا ان کے مذہب نے انہیں سچائی سکھائی ہے ؟ کیا وجہ ہے کہ پاکستان میں خصوصی طور پر اور عام طور پر سارے تھرڈ ورلڈ میں نظام نہیں چلتے؟ کیا ہمارے نظام کے اندر ہی کچھ ایسے بدیہی اور چھپے ہوئے پھندے ہیں جن میں انسان پھنس جاتا ہے ؟ یا بنیادی طور پر ہماری فطرت نافرمان ہے ؟ کیا رشوت ، سفارش ، دھاندلی کا تعلق ہماری تربیتوں کا نتیجہ ہے ؟ کیا واقعی درست تربیت کے بغیر معاشرہ بنا کر ہم پراگندہ حال ہوئے ۔ امریکی ترقی کی دیوی کے پرستار ہیں تو اس دیوی نے انہیں مالامال بھی کیا ہے۔۔۔‘‘(۳۶)

یہی وجہ ہے کہ ان کا اخلاق ہی ان کا مذہب ٹھہرتا ہے۔ اسی کی بدولت ان کے معاشرے میں آپ سکون محسوس کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں جس کے پاس گاڑی آجاتی ہے،وہ دوسری کی زندگی اجیرن بنا دیتا ہے۔ تیز رفتاری سے یا اپنی جان گنوا لیتا ہے یا دوسری کی جان لے لیتا ہے۔ بقول مصنفہ ’’ چونکہ اس دیس میں بلاوجہ ہارن بجانا گالی دینے کے مترادف ہے۔‘‘(۳۷) جب کہ یہاں عام جگہ کا تو کیا مذکور اسکول، کالج، ہسپتالوں کے آس پاس بھی ایسے ہارن دیے جاتے ہیں جیسے آپ بہروں کے دیس میں ہوں۔ مغربی معاشرے ایک اور بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ سخت گیر ہونے کے ساتھ ساتھ معاملات ومسائل کو بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے ہیں۔ سلام کرنے میں پہل کرتے ہیں۔ اور ہر ایک کے ساتھ چاہے وہ کسی بھی ملک یا قوم سے تعلق رکھتا ہو اس کو بھی نہایت خوش اسلوبی سے سلام کرنے میں پہل کرتے ہیں۔ اور اس سلام میں پہل کرنے کے لئے انہیں بعض دفعہ الفاظ بھی استعمال نہیں کرنے پڑتے ، کیونکہ ہاتھ ہلانا ہی اب سلام کا انٹرنیشنل طریقہ بنتا جا رہا ہے۔ ان کا سلام ہائے سے ہوتا ہے اور یہی ہائے گڈ مارننگ بھی ہے اور گڈ ایوننگ بھی۔

’’وہ بھی کبھی کبھی ہاتھ ہلا کر مجھے وِش کر دیتا ہے۔ مجھے کس زبان میں سلام کرتا ہے ، میں نہیں جانتا۔ اسی لئے انٹرنیشنل اشارہ ہی سلامتی برادر بنتا ہے۔ ویسے بھی انٹرنیشنل طریقہ سلام میں لفظ اہم نہیں رہے۔۔۔ ہاتھ اٹھا کر صبح بخیر کا اشارہ ہی بہت ہے۔ امریکہ میں سلام کرنے کا رواج عام ہے۔ جنگلوں میں ، راستوں پر ، بازاروں میں لوگ ایک دوسرے کو ہائے کہہ کر صبح بخیر ، شام بخیر ، شب بخیر کہنے کے عادی ہیں۔ ہلکی سی مسکراہٹ اور۔۔۔ انسان کی انسان شناسی اور خدا حافظ۔‘‘(۳۸)

اب چونکہ امریکہ مذہب کو کسی خاطر میں نہیں لاتا، اسی لئے ان کے ہاں حلال و حرام کا کوئی تصور نہیں ہے۔ وہ بلاخوف وخطر ہر جائز ناجائز چیز کھالیتے ہیں۔ یہ جائز نہ جائز صرف کھانے کی حد تک نہیں بلکہ وہ ہر جائز نہ جائز کام جو ہمارے مذہب میں حرام ہے، وہ اسے بخوشی کرتے نظر آتے ہیں۔ رشتے بنانے کا معاملہ ہو، دوستی کا، میل ملاپ کا یا کوئی اور ان کے نزدیک کسی بھی کام کی کوئی قید نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان وہاں جا کر جلدی سوسائٹی میں گھل مل نہیں سکتے کیونکہ اسلام میں کھانے، پینے، ملنے ملانے اور باہمی ربط کے بعض قاعدے قانون ہیں، جن کی پیروی ضروری ہے۔ گو مسلمانوں میں بھی بعض لوگ ہوتے ہیں جو کسی امر کی کوئی پرواہ نہیں کرتے لیکن ان کے متعلق عربی میں ایک کہاوت ہے کہ ''اِذَا لَمْ تَسْتَحْیِ فَاصْنَعْ بِمَا شِئْتَ''، یعنی جب انسان میں شرم وحیا نہ ہو تو اسے کسی کام سے باز رکھنا بلاجواز ہے۔ پھر جو اس کی جو مرضی ہو گی وہ وہی کام کرے گا۔ اسی لئے مغرب میں جب گھلنے ملنے کا سوال آتا ہے تو ایک طبقہ ایسا بھی وہاں ہے جو مرد و عورت کے باہمی آزادانہ میل جول اور حلال و حرام کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ اسے سٹیٹس سمبل قرار دیتے ہیں۔ وہ خود کو لبرل اور ماڈرن گردانتے ہیں ایسے میں ان کے نزدیک یہ سب جائز و لازمی ہے ورنہ وہ اکثریت کے ساتھ آنکھ سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکیں گے۔

> ''یہاں چاچا جی صرف وہ مسلمان امریکنوں سے میل جول رکھ سکتے ہیں جنہیں نہ تو فکر ہو کہ ذبیحہ گوشت کوئی چیز ہوتی ہے، نہ انہیں شراب پر کوئی اعتراض ہو، نہ ہی مرد عورت کے باہمی آزادانہ میل جول پر ہی برا مانیں۔۔۔ اگر ان تین چیزوں کا کچھ بھی خیال ہے تو رابطے بن نہیں سکتے۔۔۔ جیسے برصغیر میں ہندو مسلمان صدیوں ساتھ رہے لیکن گھل مل نہ سکے۔''(۳۹)

مسلمان سمجھتے ہیں کہ انگریزوں کے ملک میں ان کے زیر سایہ رہتے ہوئے بھلا ہم کیسے ان کی روایات سے منہ پھیر سکتے ہیں۔ ایسا کہتے ہوئے وہ اپنے ارد گرد موجود سکھوں کو بھول جاتے ہیں جو جس بھی ملک میں جاتے ہیں اپنی ڈھیل ڈھول، لباس، زبان کو ہمراہ لے کر جاتے ہیں۔ وہ کسی صورت اپنی ہیئت تبدیل نہیں کرتے۔ انہیں جتنی بھی گالیاں سننی پڑیں وہ سنتے ہیں لیکن اپنے دھرم کو نہیں چھوڑتے۔ لیکن معلوم نہیں کیا وجہ ہے کہ مسلمان جلد احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ شاید اس کی ایک بڑی وجہ دنیا میں مسلمانوں کے ایک طبقے کی طرف سے پھیلائی ہوئی دہشت گردی ہے، گو کہ ایک چھوٹا سا طبقہ اس تخریب کاری میں ملوث ہے لیکن اس چھوٹے سے طبقے کی وجہ سے پورا عالم اسلام بدنام ہو رہا ہے۔

خصوصاً مغرب میں نائن الیون اور اس جیسی دوسری دہشت گردسر گرمیوں کے بعد مسلمانوں کے خلاف مغرب میں ایک خاص طرح کی تعصب کی فضاء نے جنم لے لیا ہے۔اسی تعصب کا شاخسانہ ہے کہ مغرب میں مسلمانوں کا ایک گروہ اپنی شناخت ظاہر کرنے سے گھبراتا ہے۔اس کا مقصد لبرل کہلانا ہے جیسے ان کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں یا وہ مغرب سے کچھ زیادہ فرق نہیں رکھتے۔یہ طبقہ شلوار قمیص پہننے سے بچتا ہے، داڑھی رکھنے کو قدامت پسندی اور بنیاد پرستی سمجھتا ہے۔حالانکہ یہی بنیاد پرستی ان کو فواحش سے بچانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

> ''حسن تو بالکل اپنے دادا کی طرح ہوتے جارہے ہیں چاچا جی۔۔۔اب تو انھوں نے داڑھی بھی رکھ لی ہے۔میں ان سے بار بار کہتی ہوں۔بھائی اگر یہاں رہنا ہے تو لبرل ہونا پڑے گا۔ایسے ڈاڑھی واڑھی رکھنی ہے تو گھر چلیں۔کیوں چاچا جی میں ٹھیک کہتی ہوں ناں۔ڈاڑھی والے آدمی سے لوگ ایسے ہی بدک جاتے ہیں۔۔۔بھائی ٹھیک ہی کہتی ہو۔بنیاد پرستی اب الزام ہو گیا۔پہلے یہ خوبی تھی۔''(۴۰)

لیکن یہ مغربی اثر کی وجہ سے ہے ورنہ مصنفہ کے نزدیک مشرقی انسان روایت پسند ہے۔مشرق میں انسان مر تو سکتا ہے، لیکن اپنی روایات سے روگردانی نہیں کر سکتا۔کیونکہ ہمارے معاشرے میں اس کی بھاری قیمت چکانا پڑتی ہے۔خاندان، رشتہ دار، دوست، عزیز و اقارب سب کو خیر باد کہنا پڑتا ہے۔بحیثیت مجموعی مشرقی انسان اپنی روایت و رسوم اور مذہبی اقدار کو پسند کرتا ہے۔وہ فلاح کا طالب ہوتا ہے، کامیاب اخروی زندگی اس کا سب سے بڑا نصب العین ہوتا ہے۔ایسا انسان اپنی دانست میں بعض اوقات غلط فیصلے لے لیتا ہے اور اسی بنا پر لبرل یا جدیدیت پسند انہیں جاہل سمجھتے ہیں، لیکن درحقیقت ان کی یہی جہالت انہیں آہستہ آہستہ سیدھے راستے کی طرف گامزن کر دیتی ہے۔وہ غلطیوں سے سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، خدا کے آستانے پر جھکے رہتے ہیں، صبر سے کام لیتے ہیں، جلد بازی نہیں کرتے، غریبوں کا خیال رکھتے ہیں، اپنے حقوق حتی المقدور ادا کرنے کی سعی کرتے ہیں۔فلاح کا راستہ یا نروان انہیں مزید اچھا بننے پر اکساتا رہتا ہے اسی بنا پر وہ خدا والوں کو ڈھونڈتے رہتے ہیں۔اس چکر میں وہ اکثر نوسر بازوں کے ہاتھوں بیوقوف بھی بن جاتے ہیں لیکن یہ چیز بھی انہیں فلاح کی تلاش سے غافل نہیں کرتی اور وہ اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔شاید خدا کو ان کی یہی عادت پسند آ جاتی ہے جس کہ وجہ سے ان کو کسی نہ کسی رنگ میں فلاح تک رسائی ہو ہی جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ مشرقی انسان طمانیت قلبی کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے، وہ کم کھا لے گا، روکھی سوکھی پر راضی ہو جائے گا۔مگر

بے سکونی اس سے کوسوں دور ہو گی۔

> ''مشرق کو جاہل کہہ لیجیے۔ کم علم، عاقبت اندیش سمجھ لیجیے۔۔۔ دلدل میں دھنسا ہوا مشرقی انسان مکمل طور پر روایات کو نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ اپنی لوک ریت، رسم و رواج سے محبت کرتا ہے۔۔۔ شاید وہ دکھ سہتا سہتا اپنی خرابیوں میں راسخ بھی ہو جاتا ہے، لیکن فلاح کی منزل دھندلاتی نہیں۔ سائنس سے دور، ہر لحظہ کی تبدیلی سے نا آشنا، اس کے صبح و شام ایک سے گزرتے چلے جاتے ہیں۔۔۔ عام انسان کو مذہب کی اصلیت سے چاہے آگاہی ہو، نہ ہو وہ قبر پرستی، تعویذ گنڈے، پیر حضوری میں دن گزارتے ہوئے ہولے ہولے غلاظت کے ڈھیروں میں گزرتے ہوئے مست اور مجذوب کے مرحلوں سے واقف، جسم پر رنگ برنگ منکوں کی مالائیں سجائے فقیر کو سامنے پا کر مشرقی انسان کو اپنی تمامتر بدنصیبی کے باوجود یہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہ دنیا دارالمحن ہے۔۔۔ کسی قسم کی ترقی انسان کو مکمل طور پر پُر سکون، قناعت پسند، مسرت آشنا نہیں بنا سکتی۔ جب تک اوپر والے کا فضل نہ ہو، کچھ بھی مثبت نہیں ہوتا۔''(۴۱)

انہی چیزوں کی بنا پر مصنفہ نے نتیجہ نکالا ہے کہ تمام تر جدیدیت و عالمگیریت کے باوجود مشرق اور مغرب کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ دونوں کی اقدار، مذہب، اخلاقیات، رسم و رواج سب مختلف ہیں۔ مشرق اگر اپنے طور طریقے بدل کر مغرب میں مدغم ہونا بھی چاہے تو نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کو ہیومن رائٹس کے تحت بعض حقوق تو مغرب کی طرف سے دے دیے جائیں گے لیکن اس کو مساوات کبھی نہیں ملے گی۔ اس کو برابری ملنا نصیب نہیں ہو گی۔

جب وہ اپنا سب کچھ تاراج کر کے بھی برابری نہیں پا سکے گا تو وہ جتنی تیزی سے جدیدیت کی طرف گیا تھا اتنی ہی تیزی سے قدامت پرستی اور بنیاد پرستی کی طرف راغب ہو گا۔ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ کر اپنے ورثے کی حفاظت کرے گا۔ مسجدوں میں نمازی بڑھ جائیں گے، محافل و میلاد کی رونقیں نظر آنا شروع ہو جائیں گی۔ عورتوں کے سروں پر حجاب آ جائیں گے۔ ڈرگز، جنسی بے راہروی، اولاد کی غلط تربیت انہیں اپنی بنیادوں کی طرف لوٹنے کو مجبور کریں گیں۔ کیونکہ اول و آخر ان کی فطرت میں نجات اور فلاح کا خمیر ہے، وہ خمیر جوانی میں اپنا اثر دکھائے یا بڑھاپے میں، لیکن دکھاتا ضرور ہے۔ اچھی بات تب ہے جب انسان کی آنکھیں سب کچھ کھونے سے پہلے کھل جائیں ورنہ پھر انسان ساری زندگی پچھتاتا رہتا ہے۔ اس کے غم کا مداوہ پھر ساری

عمر کی نمازیں بھی نہیں کر سکتیں۔ دل میں ایک کسک، ہوک سی رہتی ہے جو تنہائی میں مزید گہری ہوتی جاتی ہے۔

اسی سبب عالمگیریت ہمیشہ انسان کی خواہشات کو بڑھاتی رہتی ہے، وہ اصل سے اس کی توجہ ہٹانا چاہتی ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ جب انسان فارغ ہو گا تو وہ اپنی ذات پر غور کرے گا۔ وہ وجہ تخلیق کائنات دیکھے گا، وہ کائنات کے اسرار ور موز پر غور و فکر کرے گا۔ اچھے برے میں تمیز کرنے لگ جائے گا۔ اسی سبب عالمگیریت انسان کو سوشل میڈیا، فلموں، گانوں، نئے ڈیزائنز، نئے ملبوسات اور نئی نئی ٹیکنالوجیز میں الجھائے رکھتی ہے۔ وہ انسان کی توجہ مذہب یا فلاح کی طرف آنے ہی نہیں دیتی، اسی سبب مصنفہ کا ماننا ہے کہ مشرق اور مغرب چاہ کر بھی کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔

"سورج مشرق سے طلوع ہوتا اور مغرب میں غروب ہو جاتا ہے۔ دونوں الگ الگ وقت کے تابع ہیں۔

مشرق تبدیلی کا خواہاں نہیں، استواری کا دلدادہ ہے۔

مشرق میں خواہش کو دبانے کا عمل ہے مغرب میں ابھارنے کا۔۔۔

یہاں عقیدہ اہم ہے اور وہاں قاعدہ۔۔۔

دونوں میں فرق اتنا زیادہ ہے کہ یہ دونوں راضی نامہ نہیں لکھ سکتے۔ اور اگر کبھی مشرق نے مغرب کی سوچ میں ضم ہونے کی کوشش کی بھی تو اس کو مذہب سے ہاتھ دھو کر فلاح کا راستہ چھوڑ کر یہ منزل مل سکے گی۔۔۔ پھر شرمندگی، احساسِ گناہ، بے حیائی کا نیا سفر ہو گا اور مشرقی لوگ۔۔۔"(۴۲)

غرض حاصل گھاٹ میں مصنفہ نے مشرق و مغرب میں مذہب و اخلاق کی حالت کی نہایت اچھوتے رنگ میں منظر نگاری کی ہے۔ ہمایوں کی شکل میں مصنفہ اس نتیجے پر پہنچتی ہیں کہ اگرچہ مغرب ایک نظام کے تابع ہے اور اسی نظام کی اتباع کی وجہ سے اس میں بعض اخلاقیات کا پیمانہ ہم سے بہت اچھا ہے لیکن چونکہ ہمارا مذہب ہمیں اخروی نجات یعنی فلاح کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے مسلمان اس دنیاوی دنیا کو دارالمحن سمجھ کر اس سے دل نہیں لگاتے۔ وہ دنیاوی خواہشات کو مغربی کلچر کے برعکس دبانا جانتے ہیں۔ وہ دنیا کے پیچھے نہیں بھاگتے، لیکن جو پیچھے بھی بھاگتے ہیں وہ بھی لاحاصل کے پیچھے بھاگتے ہیں کیونکہ ایک وقت آتا ہے جب وہ اتنی

ہی تیزی سے پھر مذہب کی جانب رجوع کرتے ہیں۔اس لئے عالمگیریت اپنی تمام کوششوں کے باوجود بھی کبھی مشرق ومغرب کو ملا نہیں پائے گی۔

ج۔عائلی زندگی اور خاندانی تناظر:

جب ہم ''عائل'' یا ''خاندان'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو بنیادی طور پر اردو میں یہ دونوں اصطلاحات تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ایک ہی معنوں میں مستعمل ہیں۔خاندان ایک بڑی اکائی ہے جس میں اجداد تک شامل ہوتے ہیں۔ایک خاندان دادا،نانا،نانی،ماں،باپ،تایا،تائی،چچا،چچی،پھوپھا،پھوپھو،خالہ،خالو،ماموں، ممانی،بہن،بھائی،یا بچوں میں سے کوئی سے کوئی سے بھی رشتوں پر مشتمل ہو سکتا ہے۔اس کے متبادل کے طور پر ایک لفظ عائل بھی استعمال کیا جاتا ہے۔لفظ ''عائل'' اپنی ہیئت میں عربی الاصل اور اردو میں عربی سے ہی وارد شدہ ہے۔عائلات اور عیال اس کی جمع بنتے ہیں۔[۴۳]

گو عائل خاندان کے معنے ہی دیتا ہے لیکن اس میں زیادہ مفہوم میاں،بیوی اور بچوں کا پایا جاتا ہے۔جیسے کہ مولوی نورالحسن صاحب ''عیال'' کے معنے کچھ یوں بیان کرتے ہیں:''عیال،زن و فرزند،بال، بچے،متعلقین''[۴۴] خاندان اور عیال،ہر دو کے لئے انگریزی لفظ Family استعمال کیا جاتا ہے۔لفظ فیملی میں خاندان اور عیال دونوں کا مفہوم شامل ہے۔[۴۵]

خاندان بنی نوع انسان کا قدیم ادارہ ہے۔تمام انسان اسی ادارے کی پیداوار ہیں۔یہی ادارہ ہے جو نسلِ انسانی کو آگے بڑھتا ہے۔یہی معاشرے کی تشکیل کا باعث بنتا ہے۔کیونکہ اس کی موجودگی کے بغیر نہ تو معاشرے کا تصور کیا جاسکتا ہے نہ ہی حکومت و مملکت کا۔ایک مشترکہ خاندان افراد کی تعداد کے لحاظ سے کافی وسیع ہوتا ہے۔اگر دادا زندہ ہے تو وہی خاندان کا سربراہ ہوتا ہے۔باپ کی وفات کے بعد بڑا بیٹا گھر کا سربراہ بنتا ہے۔خاندان کے تمام بالغ مرد کوئی نہ کوئی پیشہ اختیار کر کے رزق کما کر لاتے ہیں اور گھر کے سربراہ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔جو تمام تر گھریلو ضروریات کی فراہمی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

خاندان افراد کا ایک ایسا گروپ ہے جو ایک دوسرے سے خون،ازدواج یا اختیار کے رشتوں میں منسلک ہیں وہ اکٹھے رہتے ہیں۔اس طرح ایک معاشی یونٹ تشکیل پاتا ہے۔ان کے بچے ہوتے ہیں اور ان کی پرورش کے فرائض سرانجام دیے جاتے ہیں۔شادی دو بالغ افراد (مرد اور عورت) کو ایک قانونی حق دیتی

ہے۔ دنیا بھر میں یہ خاندان نظام موجود ہے اور معاشرے اپنے بنائے ہوئے قواعد وضوابط کے مطابق ان کو قائم رکھتا ہے۔ ہم سب کا تعلق کسی نہ کسی خاندان سے ہے اور خاندان معاشرے کا ایک بنیادی یونٹ ہے۔ ایسا بنیادی یونٹ جس میں ہم دوسرے افراد کے ساتھ مل جُل کر زندگی گزارتے ہیں۔ مشرق میں والدین اور خاندان اساتذہ کی مانند ہوتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں خاندانی رشتوں کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ خاندان مختلف طریقوں سے آداب سکھاتا ہے جس کے ذریعے ہم لوگوں کے ساتھ ہم آہنگی کے ساتھ جینا سیکھتے ہیں۔ اسی یونٹ / خاندان میں اخلاقی اقدار اور معاشرتی قواعد وضوابط سکھائے جاتے ہیں۔

> ’’دادی کے پاس قدروں کی وراثت تھی۔ وہ اقدار، رسم ورواج، مسلک روزمرہ کی کامن سنس کا خزانہ تھی۔ وہ اپنی وراثت تیسری پود کو منتقل کرنے کی خواہاں بھی تھی۔ مشرق میں یہ رواج عام رہا ہے کہ ماں باپ بچوں کی پرورش میں مشغول نہیں رہتے تھے۔ ماں کو باورچی خانہ، کپڑا لتا، صفائی ستھرائی مشغول رکھتی، باپ کفالت کی نذر ہو جاتا، لیکن گھر کے بزرگ بچوں پر کڑی نظر رکھتے۔ وہی روایت بچوں تک پہنچانے کے ضامن بھی تھے اور بسا اوقات جہالت بھی ان ہی کے وساطت سے پوتے پوتیوں نواسے نواسیوں تک پہنچتی تھی، لیکن ان کا رُعب ودبدبہ احسان اس قدر تھا کہ کوئی ان کے آگے بول نہ سکتا تھا۔‘‘(۴۶)

لیکن جدید دور میں زندگی کے معمولات کی رفتار تیز ہو چکی ہے۔ زندگی کی بھاگ دوڑ میں افراد اور خاندان پر دباؤ میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے مگر جو چیز سب سے زیادہ متاثر ہوئی وہ خاندان کے لوگوں کی آپس میں ملنا، جلنا، ملاقات ہے جن کے باہم اتحاد کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے آج کل مختلف وجوہات کی بنا پر عائلی زندگی (چھوٹے خاندان) کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ ان کو نیوکلیائی خاندان بھی کہا جاسکتا ہے۔ ایک چھوٹا خاندان ماں، باپ اور بچوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جس میں مرد اور عورت کو مساوی حقوق واختیارات حاصل ہوتے ہیں اور دونوں مل کر خاندان کا نظام چلاتے ہیں۔ البتہ یہ عائلی نظام موجودہ عالمگیر معاشرے کی پیداوار ہے اور امریکہ اس فہرست میں اول نبر پر براجمان ہے۔

جبکہ پاکستان میں فرد اپنا تشخص اور مرتبہ اپنے خاندان سے پاتا ہے۔ یہ انفرادی طور پر اخلاقیات، آدابِ معاشرت اور رویوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ شادیوں کا انتظام عموماً اہلِ خاندان کرتے ہیں اور (دو افراد کی بجائے خاندان کے درمیان اتحاد و یگانگت کا رشتہ قائم ہوتا ہے۔) اس کے برعکس امریکہ میں صنعتی معیشت،

معاشرت اور رہائشی سہولتوں کی کمی کے باعث چھوٹی فیملی کا رجحان بڑھ گیا ہے۔ خاندانی نظام کی وجہ سے پاکستان میں ابھی بھی اعلیٰ اور منفرد قدریں پائی جاتی ہیں۔ زندگی سادہ اور پُر وقار ہوتی ہے۔ بزرگوں کا احترام کیا جاتا ہے، چھوٹوں سے محبت کرنے کا رواج ہے۔ خواتین کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے دکھوں، غموں، خوشیوں اور مسرتوں میں شریک ہوتے ہیں، مسائل کو مل جُل کر اور اصلاح مشورے سے حل کیا جاتا ہے۔ دیہی معاشرہ تو بالخصوص اعلیٰ روایات سے مزین ہے۔

> ''چالیس پچاس سال پہلے مشرق کا Extended فیملی ایک بہت بڑا Support سسٹم تھا۔ اب یہ کمزور پڑ رہا ہے۔ مشرق میں زندگی خاندان کے تابع چلتی رہی ہے۔ اگر خاندان طاقتور، امیر اور عزت والا ہو تو کبھی کبھی یہ مافیا کی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے۔ فرد معاشرے کے تابع ، خاندان سے وابستہ، روایت کا پابند، اپنی شخصی آزادی کو بھینٹ چڑھا کر عافیت کی زندگی بسر کرتا رہا ہے۔''(۴۷)

ضروری نہیں کہ مشرق میں ہر چیز ہی درست ہو مگر بحیثیت مجموعی اس میں بہت سی قابلِ ذکر باتیں موجود ہیں۔ غلط قدریں مرورِ زمانہ سے ہر ثقافت میں پیدا ہو جاتی ہیں اور ان کی اصلاح ممکن ہے لیکن کسی ثقافت کی مجموعی ساخت ہی اس کا مقام و مرتبہ متعین کرتی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ مشرق کا خاندانی نظام ایک وقت میں بہت مضبوط ہوا کرتا تھا۔ خاندان محبتوں اور قربتوں کا منبع تھا۔ والدین کا ادب و احترام ہر چیز پر مقدم تھا اور یہ چیز ابھی بھی موجود ہے۔ شادیوں کے معاملات خاندان کے سبب ہی پروان چڑھتے تھے۔ خاندان سے کٹنا گویا زندگی سے کٹنا تصور ہوتا تھا۔ ہم آج بھی حکومتِ وقت سے زیادہ خاندان سے ڈرتے اور اس کا احترام کرتے ہیں۔ ملک ہمارے پر جو مرضی حد لگائے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑتا لیکن اگر خاندان کوئی پابندی لگا دے تو زندگی اجیرن بن جاتی ہے۔

> ''یہاں ابھی خاندان سے منفی اور مثبت دونوں طریق سے وابستہ ہیں۔ ہمارے رسم و رواج، لین دین، محبت اور نفرت کے سارے سرچشمے خاندان سے نکل کر بہتے ہیں۔۔۔ مشرقی لوگ شخصی زندگی میں رسم و رواج، کلچر مذہب کے پابند ہیں۔ ذات پات کی بندش کو فرد قبول کرتا ہے۔ والدین ابھی ادب کے درجے پر ہیں۔ بچے کی وجہ سے ناکام شادی کو نبھایا جا سکتا ہے۔ رشتہ داروں کی رائے آپ کی شخصیت کا تعین کرتی ہے۔ آپ اپنے متعلق جو بھی خیال رکھیں، لیکن رائے آپ کے متعلق وہی چلے گی جو آپ کا خاندان طے کرتا ہے۔ آپ

بھاری تاوان، قیمت یا مشکلات کا سامنا کئے بغیر خاندان کا پھندا گلے سے اتار نہیں سکتے۔ آپ اچھا شہری بن کر معاشرے میں عزت نہیں حاصل کر سکتے بلکہ اچھا شوہر، بھائی، بیٹا بن کر عزت کا مقام مل جایا کرتا ہے۔"(۴۸)

مشرق میں خاندان میں دور نزدیک کی کوئی قید نہیں۔اگر کوئی دادا کے بھائی یا دادا کے والد کے بھائیوں میں سے بھی ہو تو وہ آج بھی برادری مانا جاتا ہے اور اسکے لئے گھر اور دل کے دروازے کشادہ رکھے جاتے ہیں۔بیاہ،شادیوں میں ان کو بلایا جاتا ہے اور غمی میں بھی سب ساتھ دیتے ہیں۔شہر میں کسی ایک رشتہ دار کا گھر پورے محلے کی آمجگاہ بنا ہوتا تھا۔بڑے بوڑھے ،ماں بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی تھیں۔ان کا ادب و احترم سب لازم و واجب تھا۔کوئی بھی بڑا کسی بھی بچے کو غلطی پر بات سمجھا لیتا تھا۔گو آج کل عالمگیریت کے سبب خاندانی نظام کو بہت ٹھیس پہنچی ہے۔مگر یہ خاندانی رسم و رواج آج بھی کسی نہ کسی شکل میں قائم ہیں۔مصنفہ نے ناول میں اس کا تذکرہ کچھ ان الفاظ میں کیا ہے:

"ہم لوگ اچھرے میں رہتے تھے۔میرے باپ کا اتنا بڑا دل تھا کہ ہمارا گھر شہد کے چھتے کی طرح بھنبھناتا رہتا۔ گاؤں سے مقدمے لڑنے والے دیہاتی رشتہ دار۔۔۔ بیوہ غریب عورتیں۔۔۔ تعلیم کے سلسلے میں ٹھہرے ہوئے نوجوان ، شادی کی تیاریاں کرنے والی شاپنگ شاپنگ پکارنے والی لڑکیاں۔۔۔اقرا باء کا ایک ہجوم پلتا تھا ہمارے تین منزلہ مکان میں۔۔۔"(۴۹)

مگر مغرب ان سب اقدار سے عاری ہے۔وہاں یونی سیکس یا مائیکرو فیملی سسٹم پایا جاتا ہے۔ایک ایسا معاشرہ جہاں کوئی کسی کی زندگی میں دخل اندازی نہیں کر سکتا۔مرد و عورت کو برابر کے حقوق حاصل ہیں۔ہر کسی کی اپنی زندگی اور دائرہ کار ہے۔کوئی اس دائرے کے نہ اندر آ سکتا ہے نہ ہی باہر قدم رکھنا پسند کرتا ہے۔والدین،بچوں سب اپنی پسند میں آزاد ہیں۔شادی انسان نے اپنی مرضی سے کرنی ہے۔والدین کے ساتھ رہنا ہے یا الگ رہنا ہے سب اس کی صوابدید ہے۔بچوں کے حوالے سے آپ آزاد ہیں،چاہیں تو خود پال لیں، چاہیں تو بے بی سٹر لے آئیں یا انہیں ڈے کیئر ہاوسز میں چھوڑ آئیں۔لیکن کسی بھی صورت میں آپ انہیں مارنے کے مزاج نہیں ہیں۔اگر آپ ایسا کریں تو حوالہ پولیس کر دیے جائیں گے۔اسی سبب انسان کا ذہنی سکون ختم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ذہنی بیماریاں عام ہیں۔ہر وقت کام کام کی فکر میں خاندان آزاد ہیں،بیوی کا کسی اور

سے چکر ہے جبکہ خاوند کسی اور کے پیچھے پڑا ہوتا ہے۔جب چاہیں ایک دوسرے کو طلاق دے کر آپس کے راستے جدا کئے جاسکتے ہیں۔والدین بچپن میں جب اولاد کو وقت نہیں دیتے تو بچہ وقت کے ساتھ ساتھ رہنا سیکھ جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ بڑھاپے میں پھر والدین خود بھی یہ توقع نہیں رکھتے کہ اب بچے ان کا سہارا بنیں گے۔

> ”جمہوریت پسند امریکی، اینٹی کرائسٹ اور اینٹی محبت کا داعی اپنی مکمل آزادی کا خواہاں ماں باپ کو اولڈ ہومز کی نذر کرتا ہے کیونکہ بوڑھے ترقی کے راستے کی رکاوٹ ہیں۔ بچوں کو ڈے کیئر سنٹر کو حوالے کر دیا جاتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی روحیں نہ وقت کی اہمیت جانتی ہیں اور نہ آزادی کا مفہوم سمجھتی ہیں، عمر بھر کا ساتھی جس سے بیماری، تنگ دستی، موت اور زندگی کے سفر میں ساتھ نبھانے کا عہد کیا تھا، اس جیون ساتھی کو طلاق کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔“(۵۰)

مشرق میں شادی کے بعد عورت پر میاں بچوں کے ساتھ باقی سسرال کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔اسے سارے گھر کے کام کرنے پڑتے ہیں۔ لیکن مشرقی عورت ایسے حالات کی عادی ہے اور اسے کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ لیکن جو گھرانے جدیدیت کی نظر ہو رہے ہیں انہیں یہ سب کام کسی عذاب سے کم نہیں لگتے۔ایسی عورتیں اپنے کمروں میں بند رہیں گی، کسی کو منہ نہیں لگائیں گی، اپنے کام سے کام رکھیں گی۔ حتیٰ کہ بچوں کو بزرگوں کے پاس بھی نہیں جانے دیں گی کہ ان سے بچوں کو بیماریاں لگ جاتی ہیں۔ایسی عورتیں مشترکہ خاندانی نظام کو پسند نہیں کرتیں، وہ یا تو ملک سے باہر چلی جاتی ہیں یا گھر علیحدہ کر لیتی ہیں۔ہمایوں کی بہو بھی ایسی ہی ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھنے کی وجہ سے کبھی ان کے گھر سیٹ نہ ہو سکی۔یہی وجہ ہے کہ وہ پہلے سسرال چھوڑ کر میکے گئی پھر وہاں سے خاوند اور بچوں کے ساتھ امریکہ چلی گئی۔امریکہ ایسی عورتوں کے لئے کسی جنت سے کم نہیں۔ کیونکہ انہیں گھر سے باہر نکلنے کی آزادی ہوتی ہے، کسی کا اضافی بوجھ برداشت نہیں کرنا پڑتا، گھر کے کام اکیلے نہیں کرنے پڑتے۔ غرض ایک طرح کا سکون انہیں ہر پل میسر ہوتا ہے:

> ”شاہدہ کا کیا حال ہے؟۔۔۔ کوئی دسویں مرتبہ اندر کے باپ نے پوچھا۔
>
> ٹھیک ہے جی۔وہ امریکہ میں بہت خوش ہے۔ جس طرح کی آزادی اسے درکار تھی، مل گئی ہے، نہ سسرال نہ مائیکا۔ سارے جنجال ختم۔۔۔

لیکن وہاں توکام بہت کرنا پڑتا ہے۔۔۔

جہانگیر مسکرایا پھر بولا۔ کام تو ہم دونوں مل جل کر ہی کرتے ہیں۔ میں برتن دھو دیتا ہوں، وہ واشنگ کرتی ہے۔

تم۔۔۔ تم برتن دھوتے ہو جہانگیر برتن ؟۔۔۔

ابو جی۔۔۔ امریکہ میں ہر کام برابر ہے۔۔ مرد عورت کی کوئی تمیز نہیں۔۔۔ کام کام ہے۔۔۔ چاہے پرائم منسٹر کا ہو یا ٹرک ڈرائیور کا۔۔۔"(۵۱)

لیکن سب کچھ انسان کے خود کے بدلنے پر منحصر ہے۔ انسان اگر خود کو بدلنانہ چاہے تو امریکہ کیا کہیں بھی چلا جائے وہ خوش نہیں رہ سکتا۔ خدا تعالیٰ نے مرد و عورت کی حدود اور ان کے کام اسی لئے متعین کئے ہیں تا کسی پر اضافی بوجھ نہ پڑے لیکن جب انسان خدا کی دی گئی حدود سے تجاوز کرتا ہے تو پھر پریشانی ہی اس کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ یہی حالات ناول میں ارجمند کے بھی دکھائے گئے ہیں۔ اس کو جدیدیت کے زیر اثر اپنی شناخت بنانے اور کام کرنے کا جنون ہے، حالانکہ اس کا میاں ڈاکٹر ہے اور اس کی کمائی گھر کے لئے کافی ہوتی ہے۔ ارجمند اپنی مرضی سے کام کرنے کے ساتھ ہر وقت یہ گلہ بھی کرتی رہتی ہے کہ اس کا خاوند گھر کے کاموں میں اس کا ہاتھ نہیں بٹاتا۔ حالانکہ مشرقی معاشرے میں گھر اور بچوں کی ذمہ داری ماں کی ہوتی ہے۔ لیکن یہاں ارجمند اپنے باپ سے گلہ کرتی ہے کہ:

"آپ کو معلوم نہیں ابا۔ میری زندگی امریکہ میں کتنی مشکل ہے۔ میرا شوہر مجھے نہیں سمجھتا۔۔ میں پوری کوشش کرتی ہوں لیکن وہ مجھ میں۔۔۔ میرے وجود میں۔۔۔ میری ذات میں رتی بھر دلچسپی نہیں رکھتا۔ ہمارے گھروں میں مرد کو گھریلو کاموں میں دلچسپی لینا سکھایا ہی نہیں جاتا۔۔۔ وہاں۔۔۔ بڑی مشکل ہے ابا جی۔ بلال کو میری مدد کرنی چاہیے لیکن نہیں کرتا۔۔۔ میں کماؤں بھی اور گھر بھی رکھوں۔۔۔ بچے بھی پالوں۔۔۔ ارجمند کیا کیا کرے ابا جی۔۔۔ کیا کچھ کرے؟" (۵۲)

لیکن امریکہ نے اسے شخصی آزادی قرار دے کر سب کی زندگیاں جہاں آسان بنائیں ہیں وہیں ان میں بہت سوں کی زندگیاں مشکل بھی بنادی ہیں۔ اب کوئی کسی پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ اخلاقیات کا تو گویا جنازہ ہی نکل گیا ہے۔ ایک انسان اپنی زندگی میں کیا گل کھلاتا ہے مذہب یا خاندان کا اس سے کوئی لینا دینا نہیں

ہے۔خاندانی نظام کا پورا ڈھانچہ امریکہ نے ہلا کر رکھ دیا ہے۔جدید امریکی معاشرے میں حکومت شخص کو خاندان کے تابع کرنے کی بجائے نظام کے تابع بناتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ حکومت ماں باپ کی طرح لوگوں کو پالتی ہے،اگر کوئی کماتا ہے تو ٹھیک، نہیں تو ریاست باپ کی طرح ذمہ داری اٹھاتی ہے۔ اگر شادی شدہ جوڑا بوڑھے والدین یا بچوں کو نہیں سنبھال سکتی تو حکومت ان کا پورا خرچہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ اولڈ ہومز اور ڈے کیئر کا خرچہ بھی برداشت کرتی ہے۔آپ ذاتی زندگی میں جو مرضی کریں بس کسی اور کی شخصی آزادی اس سے متاثر نہیں ہونی چاہیے۔ اندازہ کریں کہ آپ شراب پئیں،طوائف کو رکھیں،ننگے گھومیں،فلرٹ کریں،ہم جنس بن جائیں،کسی کے ساتھ بھی شادی کرلیں،حکومت آپ کو نہ تنگ کرے گی نہ ہی کچھ پوچھے گی۔لیکن جیسے ہی آپ نظام کے کسی امر کی خلاف ورزی کریں گے فوراً دَر لئے جائیں گے۔گویا جدید معاشرے نے آزادی کے نام پر خاندان کو تباہ و برباد کر لیا ہے لیکن نظام کو خراب نہیں ہونے دے رہی۔

''آپ شخصی زندگی میں رکھیل رکھیں یا دوسروں سے شادی نہ کریں اور فلرٹ کر کے ڈنگ ٹپائیں۔شراب میں دھت رہیں یا بال رنگ کر پنک بن جائیں۔بچے خود پالیں یا کسی اور کے سپرد کر کے کام پر چلے جائیں،والدین کی خدمت خود کریں یا انہیں کسی بڈھا ہاؤس میں چھوڑ آئیں،حکومت دخل انداز نہیں ہوگی۔آپ ہم جنسیت میں مبتلا ہوں اور حضرت لوط کی قوم کے نافرمانوں میں سے ہو جائیں،حکومت آپ سے معذرت نہ کرئے گی۔یہ آپ کا ذاتی مسئلہ سمجھا جائے گا۔کوئی خاندانی پوچھ گچھ کے لئے حاضر نہ ہوگا۔''(۵۳)

یہی وجہ ہے کہ ہمایوں جب امریکہ میں نووارد ہوتا ہے تو نیا سماج یا جدید طرز زندگی دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے۔اس کا خیال تھا کہ وہ بچوں کے پاس بیٹھے گا،ان سے باتیں کریں گے،ان کی خدمت سے لطف اندوز ہوگا،نواسوں سے پیار کرے گا،ان کے ساتھ کھیلے گا،لیکن وہاں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا پاتا ہے۔بچوں کے پاس اپنی نوکریوں سے فرصت نہیں ہوتی، کھانا کئی کئی دن کا باسی کھانا پڑتا ہے،نواسے ہیں تو وہ اپنی دنیا میں مگن ہوتے ہیں،سارا دن وہ موبائل استعمال کرتے اور ویڈیو گیمز کھیلتے رہتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہمایوں کے ارمانوں پر اوس پڑ جاتی ہے۔لیکن چونکہ ہمایوں مشرقی معاشرے سے متعلقہ ہے اس لئے وہ جب بچوں کی مغربی طرز کی عادات دیکھتا ہے تو انہیں سمجھانے کی اپنی سی سعی کرتا ہے۔لیکن وہ بھول جاتا ہے کہ مغربی معاشرے میں کسی کی زندگی میں دخل دینا اتنا آسان نہیں رہا۔اسے پرانی سوچ کے طعنے سننے کو ملتے ہیں،بچے اپنی حالت سدھارنے کی بجائے خود ہمایوں کو وقت کے ساتھ چلنے کا مشورہ دیتے ہیں۔مرد اور عورت کی برابری کے لیکچرز سننے کو ملتے

ہیں۔ گویا پورے کا پورا نظام ہی گڈمڈ ہو املتا ہے، لیکن ہمایوں بھی مصلحت سے کام لینے میں عافیت جانتا ہے:

"آپ شاید سمجھ نہیں رہے ابو۔۔۔ زمانہ قیامت کی چال چل رہا ہے اور آپ ابھی گڈے کی سواری میں خوش ہیں۔ یہ رفتار کا زمانہ ہے ابو۔ جو بیٹھ کر سوچتا رہے گا، وہ پیچھے رہ جائے گا۔"(۵۴)

یہ ہے وہ سماج اور خاندانی نظام جس کی بانو قدسیہ نے اپنے ناول میں عکاسی کی ہے۔ پس جیسے مشرق و مغرب سمت کے لحاظ سے ایک نہیں ہو سکتے ایسے ہی مشرقی معاشرہ اور مغربی معاشرہ خاندانی اور سماجی تناظر میں ایک نہیں ہو سکتے۔ دونوں کے خاندانی رہن سہن اور تناظر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مشرق سراپہ محبت والفت ہے جبکہ مغرب سراسر شخصی آزادی پر قائم ہے۔ ایک مشترکہ خاندان جبکہ دوسرا نیوکلیئر سسٹم رکھتا ہے۔ مشرق میں عورت گھر کی نگہبان، محافظ اور مربیہ ہے جبکہ مغرب میں وہ نوکری کے لئے دربدر کی ٹھوکریں کھاتی اور پھر واپسی پر گھر کے کاموں میں لگی اپنے حالات کا شکوہ کرتی نظر آتی ہے۔

د۔ قدیم و جدید تصورِ حیات کی کشمکش:

زمانہ ازل سے جدیدت کی راہ پر گامزن ہے۔ اقدار، روایات ہر وقت میں تیزی سے بنتی اور بدلتی رہی ہیں۔ اسی کا نام زندگی ہے۔ ایک نسل اپنی جوانی اور زندگی میں جن اقدار اور ثقافتی روایات کو فالو کرتی ہے، اگلی نسل آتے آتے وہ تمام روایات فرسودہ کہلانے لگ جاتی ہیں۔ وقت اتنی تیزی سے بدلتا ہے کہ ایک نسل جو کچھ سال پہلے تک خود کو روشن خیال اور جدید گردانتی تھی، اب فرسودگی کے طعنے سننے لگتی ہے۔ یہی حال آج کے زمانے کا ہے۔ آج سے کچھ دہائیاں پہلے کا پاکستان اپنی ثقافتی روایات کی وجہ سے ساری دنیا میں جانا جاتا تھا۔ ہماری اقدار اسلامی تعلیمات کا آئینہ ہوتی تھیں، لیکن عالمگیریت کے سماجی دائرے نے ساری دنیا کو شدید سطح پر متاثر کیا ہے۔ پہلے جو جینریشن گیپ پچاس یا ستر سال میں جا کر پڑتا تھا اب وہ پانچ سات سال میں ہی اپنا اثر دکھانا شروع کر دیتا ہے۔

ناول "حاصل گھاٹ" میں اسی قدیم و جدید تصور حیات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس صورت حال کی عکاسی کے لئے جہاں ایک طرف بڑے میاں کی زبانی قدیم تصور حیات کی عکاسی کی جا رہی ہے وہیں اس کے بچوں کے ذریعے جدید تصور حیات کا بیان بھی ناول میں ساتھ ساتھ چلتا نظر آتا ہے۔ مثلاً کہانی کا مرکزی کردار ہمایوں فرید پرانے وقتوں کا آدمی ہے جو اب اپنی عمر گزار کر بوڑھا ہو گیا ہے۔ یہ

کردار مشرقی روایات کا امین کردار ہے جو قدامت پسندی کا داعی ہے۔ناول میں ہماری مشرقی ثقافت کی عکاسی اسی ہمایوں کے کردار سے ہوتی ہے۔

''تب ہم ساندہ کلاں میں رہتے تھے۔کرشن نگر سے آگے یہ متوسط لوگوں کی بستی تھی۔یہاں کے گھر پکے، صحن کے اندر اور گھروں میں بسنے والے نچلے درمیانی انکم کے لوگ تھے۔ان لوگوں کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ یہ حیادار تھے۔اپنے آپ کو قسم کی حد تک شریف سمجھتے اور دوسروں کی نظروں میں شریف رہنے کے لئے بڑے جتن کرتے، بڑی بڑی قربانیاں دے کر بھی اپنا Image برقرار رکھتے۔قرضے لینے اور دینے سے گھبراتے۔ بچوں کو گلیوں میں کھیلنے سے منع کرتے اور عورتوں کو چادر یا برقعے میں دیکھ کر اطمینان کا سانس لیتے۔ہر وقت ناک کی سیدھ چلنے میں لگے رہتے۔''(۵۵)

ہمارا معاشرہ بنیادی طور پر انہیں باتوں اور اقدار کا داعی رہا ہے۔شرم وحیا مرد وعورت کا زیور خیال کیا جاتا ہے۔نئی نئی ترقی نے ہمارے رہنے کے لئے گھر تو پکے کر دیے ہیں لیکن اس سے لوگوں کے دل بھی سخت ہو گئے ہیں۔پہلے گھر کچے تھے تو ان کے اندر احساس اور شرافت جنم لیتی تھی۔ہمارا معاشرہ بنیادی طور پر پدری معاشرہ ہے۔والد کی اجازت کے بغیر کوئی کام نہیں کیا جا سکتا۔والد کفالت کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز کا فیصلہ والد اپنی مرضی سے کرتا ہے۔والد کی گھر میں موجودگی بچوں کو سانپ سونگنے پر مجبور کر دیتی تھی۔بچوں کی کوشش ہوتی تھی کہ جتنا والد سے بچا جا سکتا ہو بچا جائے۔اگر گھر میں کبھی میوزک سنا بھی جاتا ہو تو والد کی موجودگی میں کوئی سننے کی جسارت نہ کر سکتا تھا۔بیٹیوں یا لڑکیوں کا گھر میں رہنا شرافت خیال کیا جاتا تھا اور ان کی مصروفیت گھر کے کام ہوتے تھے۔بچیوں کی دوستیں پورا پورا دن گھر میں اودھم مچائے رکھتی تھیں۔یہ سب ہمارے معاشرے کا حسن تھا جو آج گہنا رہا ہے۔

''ابا کے باہر جاتے ہی گھر میلے کی شکل اختیار کر لیتا۔۔۔شاہد بھائی سے چھوٹی رفعت آپا کی سہیلیاں نہ جانے کہاں سے آجاتیں حالانکہ ساندہ کلاں میں ہمارے پاس فون نہ تھا۔یہ لڑکیاں کھی کھی کر کے ہنسنے، گوٹے کناری کو پسند کرنے اور فلمی گانوں پر جان چھڑکنے والیاں تھیں۔''(۵۶)

یہ آج کے زمانے کی بات نہیں ہو رہی بلکہ آج سے چالیس پچاس سال پہلے کی بات ہے۔یہ ہمایوں کے

دور کے باتیں ہیں۔ یہ اس دور کی بات ہے جب جدید ذرائع مواصلات ابھی ہم تک نہیں پہنچے تھے۔ ہمارے پاس وقت اور احساس سب کچھ موجود تھا۔ سادہ، دیسی اور صحت مند غذا ہماری پہچان تھی۔ ہمارا معاشرہ پیار، محبت، دوستی کا علمبر دار تھا۔ ایک دفعہ کی محبت ساری عمر کا روگ ہوا کرتی تھی۔ خود ہمایوں ایک محبت کے سہارے اپنی ساری عمر گزار دیتا ہے۔ شادی وہ والدین کی مرضی سے کرلیتا ہے اور اسے نبھاتا بھی ہے لیکن اپنی پہلی محبت کو دل سے نہیں نکال پاتا اور بنیادی طور پر امریکہ بھی اسی کی تلاش میں پہنچ جاتا ہے۔ آج کے معاشرے میں جدید نسل کو یہ سب باتیں افسانوی لگے گیں ۔شاید دقیانوسی بھی کہیں ، لیکن یہی ہمارے معاشرے کی پہچان تھیں۔ انسان مادے سے زیادہ احساس کا پجاری تھا۔ احساس کے جس بھی رشتے میں ایک بار جڑ جاتا اسے تادمِ مرگ نبھاتا۔ انہیں حالات کا ذکر ہمایوں ان الفاظ میں کرتا ہے۔

> ”ابھی شہر میں کوئی ایم بی اے، ایم پی اے، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ٹیلی ویژن ،ڈش کیبل نہ تھا۔ ابھی تھرڈولڈ کے لئے یہ سب کچھ ایجاد نہ ہوئے تھے۔ ہم لوگ تو ابھی چھرے والی بوتل پی کر ہی خوش ہوتے تھے۔ کون ، آئس کریم ، کوکا کولا ، کے ایف سی ، میکڈونلڈ ، چینی تھائی کھانے سب ابھی وقت کی ردا میں چھپے ہوئے تھے۔ ابھی موسم آتے تو محسوس ہوتے۔ محبت ہو جاتی تو اس کی خوشبو سوتے جاگتے ساتھ رہتی۔ سارے نظام رب العزت چلاتا اور والدین کی حکومت زندگی اور گھر پر نافذ رہتی۔ بہن بھائی سے رشتہ جڑا رہتا۔ دوستی آسانی سے ٹوٹنے والی چیز نہ تھے۔۔۔ زندگی کی آبیاری کے لئے بازار، اشتہار ، مادی سہولتیں درکار نہ تھیں۔“(۵۷)

ناول میں ہمایوں کی زبانی ہمیں ان اقدار کا جابجا اظہار ملتا رہتا ہے۔ بانو قدسیہ کیونکہ خود بھی عمر کے اسی حصے متعلقہ تھیں، اس لئے ناول لکھتے وقت ان کا ذاتی مشاہدہ ان باتوں کو مزید نکھار کر پیش کرتا ہے۔

انہی دنوں کی بات ہے کہ جب ابھی معاشرہ ایئر کنڈیشنگ کی سہولت سے مستفید نہ ہوا تھا تب پورے گھر کا ایک پنکھا ہی پورے کنبے کا کفیل ہوتا تھا۔ پیڈسٹل فین رات کو گھر کی رونق ہوا کرتا تھا جس کے سامنے لیٹنا باعث فخر سمجھا جاتا تھا۔ کھیل کے میدان صرف لڑکوں کے لئے ہوتے تھے جب لڑکیاں انڈور گیمز کا سہارا لیا کرتی تھیں۔ ان میں لوڈو، تاش اور کیرم سرِ فہرست تھیں۔ اچھے موسم والے دن خاندان کے ہمراہ پکنک منانے کا رواج عام تھا۔ ایسے میں پارک بھر جایا کرتے تھے۔ پکنک پر جانے کے لئے دوست احباب سب ہمراہ ہو جایا کرتے تھے۔ رشتوں میں قریبی دوری نہیں دیکھی جاتی تھی۔

چونکہ ابھی کمپیوٹر، موبائل یا ویڈیو گیمز نہیں آئے تھے اس لئے عوام کے پاس وقت ہی وقت ہوتا تھا۔ اپنے کاموں کے لئے وقت، دوسروں کے لئے وقت، غمزدہ کو دلاسہ دینے اور تفریحی کاموں کے لئے بھی وقت ہی وقت تھا۔ وقت کا مصرف ابھی اتنا عام نہیں ہوا تھا۔ گھر میں والد کے بعد بڑے بھائی کا رعب و دبدبہ ہوتا تھا اور اس کو والد کی سی حیثیت حاصل تھی۔ ہمارا معاشرہ شرم وحیا اور پردے کی عمدہ مثال تھا۔ چادر یا برقعہ ہر دو کا رواج تھا لیکن اصل میں نظر کا پردہ لازمی تھا۔ گھر میں زور زبردستی بھی چلتی تھی لیکن عمومی ڈر کافی ہوتا تھا۔ مذہبی کہانیوں، درس اور اخلاقیات کے ذریعے بات سمجھائی جاتی تھی۔ لوگوں کی باتوں اور توقعات کا بھرم رکھا جاتا تھا۔ پردہ پوشی اور سیر چشمی پسند کی جاتی تھی۔ ہر قسم کی شدت پسندی سے پرہیز کیا جاتا تھا۔ مذہبی گفتگو، مناظرہ بازی یا بے جا بحث سے پرہیز برتا جاتا تھا۔ یہ ہمارے معاشرے کا حسن تھا جس کو جدیدیت و عالمگیریت نے شدید ٹھیس پہنچائی ہے۔

> ”جہاں تک مجھے یاد ہے ہمارے والدین اور دادا، دادای ہمیں زیادہ منع کرعادی نہ تھے۔ ان کی محبت میں چشم پوشی کی روایت گہری تھی۔ وہ مثال سے سکھانے کے عادی تھے۔ بچوں کو مذہبی درس اور اخلاقیات زبانی کلامی سکھانے کا رواج تھا۔۔۔ نہ تو ہم عمروں میں زیادہ مباحثے ہوتے، نہ ہی بڑے اونچی آواز میں نوجوانوں کو گفتگو میں گھسیٹتے۔۔۔ یہ چشم پوشی کا عہد تھا صابرین اور شاکرین کا زمانہ تھا۔ خوف میں اندر اندر پکتے رہنے کا عہد تھا۔ خوف میں ہر زمانے کے والدین لرزتے ہی ہیں لیکن اب خوف ترقی کا ہے۔ اب والدین، بڑے بزرگ اولاد کی مالی حیثیت اس کے Status کے لئے متفکر ہوتے ہیں، کردار کے لئے نہیں۔“(۵۸)

غرض یہ سب ہمارا قدیم تصور حیات ہے، ہنوز جس پر ہماری اکثریت عمل پیرا ہے۔ یہ سب وہ حقیقتیں ہیں جس کا بانو قدسیہ نے ہمایوں کی زبانی ذکر کیا ہے۔ لیکن ناول میں جہاں یہ قدیم تصور حیات موجود ہے وہیں جدید تصور حیات کا بھی طوطی بولتا محسوس ہوتا ہے۔ ہمایوں کے بیٹی ارجمند، اس کا خاوند بلال، ہمایوں کا بیٹا جہانگیر اور اس کی بیوی سب جدیدیت کے علمبردار ہیں۔ ناول میں جہاں بھی ان کرداروں کا ذکر آئے گا، لامحالہ طور پر جدید اخلاقیات اور اقدار کا ذکر آجائے گا۔ جدید نسل خود کو عالمگیر سماج میں مدغم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ انہیں قدیم تصور حیات سے کوئی سروکار نہیں، انہیں زمانے کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کا شوق ہے۔ جیسے جیسے عالمگیر معاشرہ کروٹ لیتا ہے ویسے ویسے وہ بھی اپنی شناخت کو بھولتے ہوئے نئی راہوں کی کھوج میں لگ جاتے ہیں۔ ان کے سماج میں یا یوں کہیں کہ امریکی سماج میں کسی دوسرے کی باتیں سننے، نصیحتوں پر کان دھرنے، لمبی لمبی تقریریں سننے، اخلاقیات کا درس لینے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ وہ

خود کو ہر فیصلے میں آزاد تصور کرتے ہیں اور کوئی ان کے معاملے میں ٹانگ نہیں اڑا سکتا۔

مشرقی معاشرے میں والدین کی عزت و تکریم کی جاتی ہے۔ اگر وہ بیمار ہوں تو ان کے لئے علیحدہ کھانا تیار کیا جاتا ہے۔ والدین کے پاؤں دبانا خدمت تصور کی جاتی ہے، ایک ایسی خدمت جس کے بدلے انہیں جنت میں جگہ ملے گی۔ مگر جدید معاشرے میں تو انسان کے پاس خود کے کھانے اور خیال رکھنے کا وقت نہیں ہے، وہ بھلا کسی دوسرے کا خیال کیسے رکھ سکتا ہے۔ یہی چیز ارجمند اور اس کے والد ہمایوں کے کردار میں نظر آتی ہے۔ ہمایوں کو شروع سے اس کی بیگم اصغری نے پاؤں کا چھالا بنا کر رکھا تھا، مگر جب وہ بیٹی کے اصرار پر اسے ملنے امریکا آتا ہے تو بیٹی اپنے والد کا خیال رکھنا تو کیا، اسے کھانا بنا کر دینا بھی محال نظر آتا ہے۔

> ''ہم ایک دن Left Overs کھاتے ہیں اور سنڈے کو کوکنگ کرتی ہوں اور سارے ہفتے کی dishes تیار کر کے فریزر میں رکھ دیتی ہوں۔ میرا خیال ہے آپ مائنڈ نہیں کریں گے۔ دیکھئے ناں مجھے بھی کام پر جانا ہوتا ہے۔ آپ فریزز میں سے کچھ نہ نکالیں اور جو کچھ فریج میں رکھا ہوا ہے، آپ مائیکرو ویو اوون میں ڈال کر گرم کر لیں۔ ہم ڈسپلن سے Organzie ہو کر زندگی گزارتے ہیں۔۔۔ افسوس میں آپ کی ویسی خدمت نہیں کر سکتی جیسی پاکستان میں کرتی تھی۔ لیکن امید ہے آپ یہاں کے طریقے سیکھ جائیں گے۔''(۵۹)

یہاں بانو قدسیہ نے جدید معاشرے کے ایک اہم رویے کی طرف قاری کی توجہ دلائی ہے۔ عالمگیر معاشرے نے انسان کی زندگی اتنی مشکل بنا دی ہے کہ جب تک میاں بیوی دونوں کمائی نہ کریں، گھر کا گزارا نہیں چلتا۔ لیکن ایسے میں ضروری نہیں کہ ہر جگہ حالات ایسے ہی ہوں۔ اکثر جگہوں پر خواتین شوقیہ کام کرتی ہیں، گویا کہ وہ خود مختار ہونا یا دوسروں کو خود مختار دکھانا چاہتی ہیں۔ یہی حال ہمایوں کی بیٹی ارجمند کا ہے۔ بلال پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہے اور ایسا نہیں کہ ان کا گزارا نہیں ہوتا۔ لیکن ارجمند کا اصرار ہے کہ وہ اپنی شناخت بنانا چاہتی ہے۔ صرف شناخت بنانے کے لئے وہ گھر، اولاد، والدین سب کی قربانی دینے پر تیار نظر آتی ہے۔ اب چونکہ بانو قدسیہ خود قدیم تصور حیات اور عورت کے متعلق مشرقی معاشرے جیسی سوچ کی حامل ہیں، اس لئے عورت کے جدید تصور کی وہ خود بہت بڑی ناقد ہیں۔ لیکن خوبصورتی یہ ہے کہ وہ اس حوالے سے خود براہ راست بات نہیں ٹھونستی ہیں بلکہ پورا سیاق و سباق سمجھا کر قاری کو بات پر قائل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ایسے میں جدید و قدیم تصور حیات میں ہمیں ایک کشمکش نظر آنا شروع ہو جاتی ہے۔

”پیسے کی بات نہیں ہے ابو۔ پیسے تو کافی ہیں، لیکن میں سارا دن کیا کروں۔ مجھے بھی تو اپنی شناخت چاہیے۔ بلال ابھی بھی آپ کے زمانے میں رہ رہا ہے بلکہ دادا جی وقتوں میں زندہ ہے۔ اب عورت پاؤں کی جوتی نہیں۔ مرد نہاتا دھوتا گھوڑا نہیں ہوا کرتا آج کل۔ عورت کا اب سسرال سے جنازہ ہی نہیں اٹھتا۔ وہ اپنی مرضی سے واک آؤٹ بھی کر سکتی ہے۔۔۔ وہ بڑبڑاتی چلی جاتی ہے۔ گھر پر کوئی موجود نہیں۔ میں ناشتہ کرنا چھوڑ دیتا ہوں۔“(۶۰)

پہلے والدین کے لئے باسی کھانے کا ذکر کر کے، پھر پیسے کی افراط دکھا کر مصنفہ آخر میں پنچ لائن لے کر آئی ہیں کہ ”گھر پر کوئی موجود نہیں، میں ناشتہ کرنا چھوڑ دیتا ہوں“۔ گویا جدید عورت اپنی شناخت تو بنانا چاہتی ہے لیکن وہ کام جو قدیم مشرقی اور اسلامی معاشرے میں عورت کو تفویض کئے گئے ہیں وہ اسے مکمل کرنا اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتی۔ یہی وجہ ہے کہ نہ والدین کا احساس باقی رہا ہے اور نہ ہی اولاد کی درست تربیت ہو پاتی ہے۔ اس چیز کو حقوق نسواں کا نام دیا جا رہا ہے۔ عورتوں کے بھی بعض حقوق ہیں جو انہیں ضرور بالضرور ملنے چاہئیں، لیکن بات اتنی سادہ ہو تو مزید کیا چاہیئے۔ اصل بات یہ ہے کہ عورت کو اگر بعض حقوق ملنے چاہئیں تو گھر جو عورت کی ذمہ داری ہے اس سے عہدہ براہ کون ہو گا؟۔ عورت اگر سارا دن فقط اپنے شوق کی تسکین کی خاطر باہر کام کرتی رہے گی تو گھر کون سنبھالے گا؟ بچوں کا خیال، ان کی تربیت کس کی ذمہ داری ٹھہرے گی؟ مرد عورت سے بھی زیادہ باہر کام کرتا ہے اور بعض اوقات کام زیادہ سخت اور محنت طلب بھی ہوتا ہے، نتیجتاً وہ گھر کی ضروریات پوری کرنے کے لئے مفوضہ خرچہ بھی فراہم کر دیتا ہے۔ ایسے میاں بیوی کام کے بعد بچوں اور گھر کا ویسے ہی خیال رکھ سکیں گے جیسے ارجمند اور بلال رکھتے ہیں۔ دونوں کے پاس خود کے لئے وقت نہیں ہوتا چہ جائیکہ بچوں کو کھانا بنا کر دیں یا ان کے کام کریں۔ اسی سبب کہا جاتا ہے حقوق نسواں کی تحریک نے جہاں عورت کو فائدے دیے ہیں وہیں گھر کا نظام درہم برہم کر دیا ہے۔ گھر کا سکون اور چین سب غارت ہو گیا ہے:

”مغرب میں حقوق نسواں کی تحریک مردوں کے مساوی مقام اور حقوق کے لئے شروع ہوئی تھی لیکن حقوق کے نام پر عورت کو جو کچھ ملا ہے۔۔۔ اس کے نتیجے میں اس کی زندگی شدید مسائل اور مشکلات کا شکار ہو گئی ہے۔ گھر کا سکون اور تحفظ اس سے چھن گیا ہے۔ خاندان کے ادارے کی ٹوٹ پھوٹ نے اسے بالعموم مستقل رفیق حیات کی معیت سے محروم کر دیا ہے۔“ (۶۱)

بات اگر یہیں تک محدود رہتی تو شاید کفایت کر جاتی لیکن آگے بانو قدسیہ حقوق نسواں اور جدیدیت کی مزید ایک ''روشن خیالی'' کا ذکر لے آتی ہیں۔ وہ لباس ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ لباس ننگ ڈھانکنے اور ناموس وعزت کا رکھوالا ہونا چاہیے لیکن جب انسان یہ تہیا کر لیتا ہے اسے جدید معاشرے میں داخل ہونا ہے تو اسے اچھائی برائی میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کی سہولت مقدم ہے، باقی اسلامی یا مشرقی تعلیم کچھ بھی، اس سے اس کا کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اس کو اپنا لباس قدامت پسندانہ محسوس ہوتا ہے۔ لباس بوجھ بن جاتا ہے۔ ننگ ظاہر کرنا معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ اور اگر کوئی ایسا سوچے یا کوئی اس طرف توجہ دلائے تو وہی مجرم ٹھہرتا ہے۔ یہی ارجمند کا ہے۔ سکرٹ، بلاؤز پہننا اس کے نزدیک آج کے زمانے کی ضرورت ہے اور صرف ضرورت ہی نہیں ایک طرح کی سہولت بھی ہے۔ ارجمند نہایت خوبصورتی اور ڈھٹائی سے اپنے والد کو اپنے بلاؤز اور سکرٹ پہننے کا جواز یہ کہہ کر پیش کرتی ہے کہ ڈوپٹہ ادھر ادھر اٹکتا رہتا ہے جس سے کام میں دشواری آتی ہے، اس لئے جینز وغیرہ ایسے کاموں میں سہولت بہم پیدا کر دیتی ہیں۔ بانو قدسیہ نے ارجمند اور ہمایوں کے مابین اس مکالمے کا نقشہ کچھ یوں کھینچا ہے:

> ''ارجمند سے پوچھا۔۔۔ یہ تم نے اپنی شلوار قمیض کیوں چھوڑ دی ارجمند؟۔۔۔
>
> بات یہ ہے ابو۔۔۔ انسان کو پانی کی رو کے ساتھ بہنا پڑتا ہے۔ میں شلوار قمیض میں بہت Odd محسوس کرتی ہوں۔۔۔ main stream سے کٹ جاتا ہے آدمی۔
>
> لیکن اپنی شناخت تو رہتی ہے ارجمند۔۔۔
>
> ہاں رہتی تو ہے ابو۔۔۔ لیکن اگر لوگ اس شناخت کے باعث آپ سے نفرت کرتے ہوں تو، آپ کو کمتر جانتے ہوں تو پھر اپنا لباس چھوڑنا پڑتا ہے۔ نیا چولا پہننا پڑتا ہے۔
>
> میں خاموش ہو جاتا ہوں۔
>
> ابو شلوار قمیض گھریلو لباس ہے۔ اوپر سے ڈھائی تین گز کا دوپٹہ بڑا Cumbersome ہوتا ہے۔ کبھی میز میں پھنستا ہے کبھی کرسی میں۔۔۔ کام پر تو یہی جینز کام آتی ہے بہت پریکٹیکل۔۔۔'' (٦٢)

گویا کہ جدید عورت بس اپنی سہولت اور شناخت چاہتی ہے۔ اس کے علاوہ اسے کسی اور چیز سے سروکار نہیں ہے۔ لباس خواہ جیسا بھی ہو اور گھر بے شک کسی اور کے سہارے چلے۔ نئی پود کو باہر نکل کر اپنے

لئے سہولیات اور الگ پہچان بنانا ہوتی ہے۔ قدیم تصور حیات کے حامل بزرگ جب ان باتوں کو سنتے ہیں تو اپنی عادت سے مجبور بچوں کو چھوٹے بچے سمجھ کر سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ امر بھی الٹا ان کے سر پڑ جاتا ہے اور انہیں مزید دلیلیں اور باتیں سنا پڑتی ہیں۔ انہیں دقیانوسی کے طعنے سہنے پڑتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ زمانے کے مطابق خود کو بدلیں۔ ان کے نزدیک زندگی ایک بار ملنے والی چیز ہے، اسے ایسے ہی بورنگ نہیں گزارنا چاہیے بلکہ لائف انجوائے کرنی چاہیے۔ پہلے وقتوں میں ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا لیکن اب جدید نسل اسراف کو کچھ برا نہیں سمجھتی۔

''اگر تم جیسے روشن دماغ یہاں بیٹھ رہے تو وہاں کیسے ترقی ہوگی ارجمند۔۔۔بیک ہوم لوگ کیسے بدلیں گے؟ میں خوامخواہ کہتا ہوں۔۔۔

مجھے معاف کریں ابو، ہم اس دنیا میں سوشل ورک کے لئے نہیں آئے۔۔ایک زندگی ہے، اسے ہم انجوائے کرسکتے ہیں تو کیوں نہ کریں۔ جب ہم چیزیں Afford کرسکتے ہیں تو کیوں نہ کریں۔ جب ہم بہتر معیارِ زندگی اپنا سکتے ہیں تو کیوں نہ اپنائیں ابو۔۔۔ زندگی صرف ایک بار ہے۔۔۔''(۶۳)

غرض نئی نسل بس زندگی انجوائے کرنے پر یقین رکھتی ہے۔ خاندان، اقدار، روایات اس سے انہیں کچھ سروکار نہیں ہوتا۔ ان کے نزدیک اگر آپ چیزیں خریدنے کی اہلیت رکھتے ہیں تو پھر بیشک دنیا جہاں کا سارا مال گھر میں لا کر سٹور کرلیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج برانڈز نے سادگی کی جگہ لے لی ہے۔ نت نئے ڈیزائن مارکیٹ میں لائے جاتے ہیں اور پھر ان کی مارکیٹنگ کی جاتی ہے۔ بوتیک نے درزی کی جگہ لے لی ہے۔ ہر موسم کے لئے نیا فیشن اور نیا ٹرینڈ چلتا ہے۔ بازار عورتوں سے بے ہنگم بھرا ہوا ہوتا ہے۔

ایک زمانے میں بڑی بوڑھی عورتیں پوتوں اور نواسوں کے ساتھ کھیل کر دل بہلاتی تھیں۔ گھر میں ان کا کھانا مستند جانا جاتا تھا۔ نہ جانے کتنے جتن کرکے وہ دیسی مصالحے پیستی تھیں اور دیسی اور صحتمند کھانے بناتی تھیں، لیکن آج کی دنیا کو سلم اسمارٹ ہونا زیادہ اچھا لگتا ہے۔ لڑکیاں سارا سارا دن کچھ نہیں کھاتیں، وہ ڈائیٹنگ کرتی ہیں تاکہ موٹی نہ ہوں۔ جب کہ ایک بڑی اکثریت بازاری کھانے یا جنک فوڈ پر گزارا کرکے خوش ہوتی ہے۔ مشرقی کھانوں کی جگہ چائینیز اور مغربی کھانوں نے لے لی ہے۔ یہی وجہ ہے ان چیزوں نے ہمارے بزرگوں کو گہرے گھاؤ لگائے ہیں۔ پہلے وہ گھر کے کاموں میں لگ کر اپنا آپ بھول جاتی تھیں، انہیں کوئی بیماری

ہوتی بھی تھی تو مصروفیت میں اس کا احساس نہیں ہوتا تھا لیکن اب بچے موبائل میں اور پوتے پوتیاں آن لائن گیم پر سارا دن گزارتی ہیں، کھانے باہر کے کھا کر سب اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے ہیں۔ ایسے میں بزرگوں کے پاس نہ کوئی باتیں کرنے والا بچتا ہے کہ کوئی باتیں سننے والا۔ نتیجتاً وہ بیماریوں کی پوٹلی بن کر اس دنیا سے جلدی رخصت ہو جاتے ہیں۔

> ''اب زمانہ بدل گیا ہے۔ بہوئیں پوت لے کر چمپت ہو جاتیں۔ رشتہ دار امیر ہونے کے بعد مشورے مانگنے میں اپنی ہتک محسوس کرتے۔ کھانے پکانے کی جو ترکیبیں درکار تھیں، ان کا نام بھی بڑھیا نے نہ سنا تھا۔ نہاری، سموسے، پلاؤ، شامی کباب اور ایسے ہی گھریلو پکوان آؤٹ ہو چکے تھے۔ ڈائٹنگ کرنے والی لڑکیاں اب مغربی کھانوں پر سوئچ آن کر چکی تھیں۔ چینی کھانا اِن تھا۔ کپڑوں کے لئے ماڈلز اور بوتیکوں کی طرف رجوع تھا۔ ڈیزائنز کپڑوں کی تلاش جاری رہتی تھی۔ اس لئے بڑی بوڑھی عورتیں گھٹنوں کے درد، ذیابیطس اور بلڈ پریشر کے چکروں میں کھو گئی تھیں۔''(۶۴)

قدیم و جدید کی یہ جنگ صرف سماجی یا معاشرتی معاملات تک محدود نہیں بلکہ اس کا دائرہ کار پوری زندگی پر پھیل گیا ہے۔ انہوں نے ہر غم یا احساس کو مادیت کا جامہ پہنا دیا ہے۔ قدیم تصورِ حیات میں غم ابدی قرار دیا جاتا تھا۔ مسائل کو اللہ کی رضا سمجھ کر انسان چپ ہو جایا کرتا تھا۔ مگر اب ایسا نہیں رہا۔ مغرب چونکہ خدا سے ان معاملات کا تعلق نہیں جوڑتا اس سبب ان مسائل سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اپنی سی سعی کرتا رہتا ہے۔ عورت کو آزادی دینی ہو، بوڑھے لوگوں کو اولڈ ہاؤسز بھیجنا ہے یا نہیں بھیجنا، غریبوں کے دکھوں کا مداوا کیسے کرنا ہے، کسی بیماری کا علاج کیسے کرنا ہے اور آئندہ ایسی بیماریوں کا کیسے دفاع کرنا ہے، فرد کو معاشرے کا مفید وجود کیسے بنانا ہے، ان سب چیزوں کے لئے تھنک ٹینک بن گئے ہیں، سوشل سائنسز کا قیام عمل میں آ گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ سدھارتھ کے باپ سے لے کر آج تک کوئی بھی فرد یا معاشرہ غم کو کلیتاً ختم نہیں کر سکا لیکن ایسے کم از کم وہ کسی نہ کسی معاملے میں مصروف رہ کر دل کی تسلی کرتے رہتے ہیں۔ یہی طریقہ کار انہوں نے مذہب کے ساتھ بھی روا رکھا ہوا ہے۔ مذہب کو انہوں نے جدید خطوط پر استوار کر لیا ہے۔ انہوں نے مذہب کو ایک رسمی عبادت قرار دے دیا ہے۔ دل کی تسلی کے لئے ویکنڈ کی ویکنڈ عبادت گاہوں سے ہو آتے ہیں اور دل کو آسرا مل جاتا ہے۔ ان کے دیکھا دیکھی مشرقی عوام بھی اسی خبط میں مبتلا نظر آتی ہے۔

''سفید فام لوگ مسئلے کو شطرنج کا کھیل بنا کر کھیلتے ہیں اور نڈھال نہیں ہوتے۔ سائنس دان نبرد آزما ہونے کے لئے لیبارٹری میں جا پہنچتے ہیں۔ سوشل سائنس کے گرویدہ انسانی دکھوں کے خلاف پلاننگ میں مشغول رہتے ہیں۔۔۔جب ملیریا اور ٹائیفائڈ کا علاج نکل آئے تو ایڈز، کینسر، الزائمر مسئلہ بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن امریکی معاشرہ مسائل کو ختم نہیں کرنا چاہتا۔ وہاں زندگی اور ترقی کا راز ان ہی شعوری کوششوں کا نتیجہ ہے۔ مشرق میں اندر فلاح کے لئے جو ڈیرے، منہ سن ڈے سکول، زوایے، گرو، مرشد تھے ان کے علم کو ظنی سمجھ مشرقی اکثریت انہیں چھوڑتی چلی جا رہی ہے۔''(۶۵)

پس جیسے ازل سے قدیم و جدید کا معرکہ باہم بر سرپیکار ہے ایسے ہی آج بھی دونوں میں ہو بہو ویسے ہی کشمکش جاری ہے۔ نوجوان نسل آج بھی آزادی پسند ہے اور جدید سے جدید رویوں کی تلاش میں سرگرداں ہے جبکہ بوڑھے بزرگ اپنے تجربے کی روشنی میں انہیں تھوڑا دھیمے دھیمے چلنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ وہ جدیدیت کے خلاف نہیں ہیں، بس چاہتے ہیں کہ تھوڑا پھونک پھونک کر قدم رکھا جائے۔ ثقافتی وحدت کو پارہ پارہ ہونے سے بچایا جائے، اچھے اور برے میں تمیز کر کے آگے بڑھا جائے۔ خاندانی اقدار کا خیال رکھا جائے، صحت کو پیش نظر رکھیں، اغیار کے آگے بالکل سرنگوں نہ ہو جائیں۔ اگرچہ جدیدیت کی تلاش میں ہمارا بہت کچھ داؤ پر لگ چکا ہے مگر مصنفہ کو ابھی بھی موہوم سی امید ہے کہ شاید نوجوان نسل سدھر جائے اور ہمارا مستقبل محفوظ ہاتھوں میں منتقل ہو جائے۔

حوالہ جات

۱۔ Hornby, AS, Oxford Advanced Learners Dictionary, Oxford University Press, 2010, P 659

۲۔ مظہر عباس،ڈاکٹر/ لیاقت علی،ڈاکٹر،عالمگیریت: سماجی تناظر اور اردو ناول،(مضمون) مشمولہ: تحقیق نامہ، شمارہ ۲۵، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۱۲۸

۳۔ فیروزالدین، مولوی، فیروز اللغات، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۵۲ء، ص ۸۸۹

۴۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، لسانیات اور تنقید، پورب اکیڈمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۹۵

۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی اصطلاحات (توضیحی لغت)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۱۸۵

۶۔ اقبال آفاقی، ڈاکٹر، مابعد جدیدیت: فلسفہ و تاریخ کے تناظر میں، مثال پبلیشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۳ء، ص ۲۰۶

۷۔ لال خان، ڈاکٹر، تناظر ۲۰۰۰ء سوشلسٹ انقلاب اور پاکستان، طبقاتی جدوجہد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۱۳

۸۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، عالمگیریت اور ثقافت (مضمون)، خیال نامہ
https://khayyalnama.com/tanqeed/

۹۔ باقر مہدی، نئی تعلیم کے مسائل، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دھلی، ۲۰۱۱ء، ص ۷۸۔۷۹

۱۰۔ وہاب اشرفی، مابعد جدیدیت: مضمرات و ممکنات، کتاب محل، الہ آباد، ۲۰۰۲ء، ص ۱۲۱

۱۱۔ ایس ایم شاہد، اسلام اور جدید سیاسی و عمرانی افکار، ایور نیو بک پیلس، لاہور، س۔ن، ص ۳۵۳

۱۲۔ بانو قدسیہ، حاصل گھاٹ، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء ص ۳۳

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۲۳

۱۴۔ ایضاً، ص ۴۲

۱۵۔ ایضاً، ص ۴۳

۱۶۔ Patricia Bradley, Making American Culture, Palgrave Macmillan, New York,2009, pg10

۱۷۔ ایضاً، ص۲۸۱

۱۸۔ ایضاً، ص۸۱

۱۹۔ ایضاً، ص۱۸۴

۲۰۔ ایضاً، ص۹۰

۲۱۔ ایضاً، ص۶۱

۲۲۔ ایضاً، ص۱۷۴

۲۳۔ ایضاً، ص۱۲۰

۲۴۔ ایضاً، ص۵

۲۵۔ ایضاً، ص۲۷۲

۲۶۔ ایضاً، ص۲۷۱

۲۷۔ ایضاً، ص۱۹۰

۲۸۔ ایضاً، ص۱۳۰

۲۹۔ ایضاً، ص۱۳۹

۳۰۔ ایضاً، ص۲۷۶

۳۱۔ کلیم اللہ، سماج کا ارتقا، سنگم پبلیشرز لمیٹیڈ، لاہور، س۔ن، ص۲۳۰

۳۲۔ بانو قدسیہ، حاصل گھاٹ، ص۳۰

۳۳۔ ایضاً، ص۲۸

۳۴۔ ایضاً، ص۴۴

۳۵۔ ایضاً، ص۲۷

۳۶۔ ایضاً، ص۴۶

۳۷۔ ایضاً، ص۱۱۸

۳۸۔ ایضاً، ص ٦
۳۹۔ ایضاً، ص ١٧٦
۴۰۔ ایضاً، ص ١٧٩
۴۱۔ ایضاً، ص ۱۳۱
۴۲۔ ایضاً، ص ۱۳۱
۴۳۔ لوئیس معلوف، المنجد فی اللغۃ، المکتبہ الشرقیہ بیروت، لبنان، ۱۹۹٦ء، ص ۵۳۸
۴۴۔ نور الحسن منیر کاکوروی، مولوی، نور اللغات (جلد سوم)، جنرل پبلشنگ ہاؤس، کراچی، س۔ن، ص ۵۳۱
۴۵۔ Hornby,AS Oxford Advanced Learners Dictionary, Oxford University Press, 1986, P 309
۴٦۔ بانو قدسیہ، حاصل گھاٹ، ص ۲۱۰
۴۷۔ ایضاً، ص ۲۷۵
۴۸۔ ایضاً، ص ۲۷۸
۴۹۔ ایضاً، ص ۲۵۱
۵۰۔ ایضاً، ص ۸۱
۵۱۔ ایضاً، ص ۱۵٦
۵۲۔ ایضاً، ص ۲۲۴
۵۳۔ ایضاً، ص ۲۷۷
۵۴۔ ایضاً، ص ۱۴۰
۵۵۔ ایضاً، ص ١٦
۵٦۔ ایضاً، ص ۲۳
۵۷۔ ایضاً، ص ۳۰۴

۵۸۔ ایضاً، ص۲۶۶

۵۹۔ ایضاً، ص۹

۶۰۔ ایضاً، ص۲۲۷

۶۱۔ ثروت جمال اصمعی، مغرب اور اسلام، (مضمون) مطبوعہ: عورت مغرب اور اسلام، جلد ۱۵، شمارہ ۱، ۲۰۱۲ءانسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، س۔ن، ص۸۶

۶۲۔ بانو قدسیہ، حاصل گھاٹ، ص۳۷

۶۳۔ ایضاً، ص۵۲

۶۴۔ ایضاً، ص۹۲

۶۵۔ ایضاً، ص۲۳۹

تیسرا باب

حاصل گھاٹ میں پاکستانی اور امریکی ثقافت کی سیاسی شناختیں

الف۔ سیاست کے پاکستانی و امریکی امتیازات:

پاکستان اور امریکہ نہ صرف سماجی، معاشی یا ثقافتی حوالے سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ سیاسی حوالے سے بھی دونوں میں بہت سے امتیازات موجود ہیں۔ لیکن اس حوالے سے بات سمجھنے کے لئے ہمیں پہلے لفظ سیاست کو سمجھنا ہو گا۔ مصنف فرہنگ آصفیہ کے مطابق سیاست عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے لغوی معنی ملک کی حفاظت و نگرانی، انتظامِ ملک یا بندوبست اور نظم و نسق وغیرہ کے ہیں۔(۱) اس طرح ڈاکٹر مقصود جعفری نے سیاست کے معنوں میں عوام کی فلاح و بہبود کے علاوہ عوامی رائے کی شمولیت کو بھی لازم ٹھہرایا ہے:

> "سیاست کے لغوی معنی امورِ مملکت کی دیکھ بھال اور ریاست میں عوام کی فلاح و بہبود کے لئے عوامی رائے کی شمولیت ہے۔"(۲)

لیکن اصطلاحی اعتبار سے یہ لفظ بعض اوقات حکمت و دانائی کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ گویا سیاست بنیادی طور پر کسی ریاست اور حکومت کے درمیان ایک تعلق کا نام ہے۔ چنانچہ انگریزی زبان کا لفظ (Politics) دراصل یونانی زبان کے لفظ (Polis) سے نکلا ہے۔ جس کے معنی شہری ریاست یا شہر کے ہیں۔

سیاست ایک ایسا معاشرتی ادارہ ہے جس کے ذریعے کچھ لوگ یا گروپ اقتدار حاصل کرتے ہیں۔ حکومت یا ریاست کی صورت میں سیاست ہر معاشرے میں موجود ہوتی ہے اور ہر معاشرے کے کچھ تنظیمی اصول ہوتے ہیں جن میں اقتدار، کردار و عمل اور ذمہ داریوں کا تعین ہوتا ہے۔ یہ اصول و قوانین زبانی بھی ہوتے ہیں اور تحریری بھی۔ لیکن کچھ معاشروں میں تو ان قوانین پر سختی سے عمل ہوتا ہے اور کچھ میں تنظیم اتنی سخت نہیں ہوتی۔ جبکہ حکومتی ادارے اقتدار اور اتھارٹی کا استعمال کرتے ہیں۔ یوں حکومت طاقت کا استعمال کرتے ہوئے دوسرے معاشروں اور سیاسی اکائیوں سے تعلقات قائم کرتی ہے۔ کیونکہ سیاست آج کے دور میں ایک اہم سیاسی ادارہ ہے جو ایک مخصوص خطۂ زمین پر حکمرانی کرتا ہے۔

سیاست میں کوئی برائی نہیں ہے اور نہ ہی یہ کوئی برا شعبہ ہے۔ یہ تو محض اپنے اختیارات کو استعمال کرنے کا ایک طریقہ ہے تاکہ معاملات کو بہتر بنایا جائے۔ اچھے لیڈر اس بات کو سمجھتے ہیں اور سیاست کو اپنے فائدے کے لئے استعمال بھی کرتے ہیں۔ اس کے لئے طاقت کے نظامِ ہائے کار کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ سیکھانا ہوتا ہے کہ کن معاملات پر توجہ مبذول کرنی ہے اور کن معاملات کو نظر انداز کرنا ہے۔ گویا سیاست کی اصطلاح کو اکثر انتظامِ اختیار کے تناظر میں دیکھا جاتا ہے اور عام طور پر اس سے منفی تاثر ہی لیا جاتا ہے کیونکہ سیاست اقتدار اور طاقت عطا کرتی ہے اور بدقسمتی سے سیاست میں اکثر اوقات اقتدار اور طاقت حاصل کر لینے کے بعد اہلِ اقتدار اور اتھارٹی طاقت کا ناجائز استعمال کرتے ہیں جس کے باعث ''کرپشن'' پھیلتی ہے۔

اسی تناظر میں اگر پاکستان اور امریکہ کے سیاسی امتیازات کا جائزہ لیا جائے تو پہلی حقیقت جس سے ہم دوچار ہوتے ہیں وہ یہ ہے کہ امریکہ سیاسیات کے اعتبار سے تقریباً دو صدیوں پرانے اور تجربہ کار نظام کا حامل ملک ہے۔ اتنا لمبا عرصہ گزارنے کے سبب آج امریکہ دنیا میں سیاسیات کے اعتبار سے ایک معتبر حیثیت کا حامل ہے۔ امریکی عوام سیاسی فوائد سے بقدر مقدور حصہ اٹھا رہے ہیں کیونکہ ان کا آئین گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اپنی جڑیں گہرائی سے عوام میں پیوست کر چکا ہے۔ اس کے بالمقابل پاکستان ایک نوزائیدہ ریاست ہے اور اپنے اوائل سے ہی بقا کی جنگ لڑنے میں مصروف ہے۔ اسی کا شاخسانہ ہے کہ آزادی ہند کے بعد مغربی پاکستان خود ہم سے آزادی حاصل کر چکا ہے۔ ہم پون صدی سے بھی کم عرصے میں تین آئین بنا چکے ہیں جبکہ ہنوز آئین کی عملداری پر سوالیہ نشان موجود ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے لیکن امتیازی رنگ میں سر فہرست بھی یہی ہے۔

دونوں ممالک کا بنیادی سیاسی ڈھانچہ انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ پر مشتمل ہے۔ انتظامی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو امریکہ اور پاکستان دونوں وفاقی طرز کا نظام رکھتے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ امریکہ صدارتی جبکہ پاکستان پارلیمانی طرز حکومت کا حامل ملک ہے۔ وفاقی طرز حکومت کے سبب دونوں ممالک میں ریاستوں یا صوبوں کو وفاق کی نمائندگی میں اختیارات حاصل ہیں لیکن امریکہ میں ریاستیں زیادہ خود مختار ہیں جبکہ پاکستان میں صوبے آج بھی وسائل کے لئے وفاق کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ امریکہ میں صدر بیک وقت ریاست اور حکومت کا سربراہ ہوتا ہے۔ اس لئے صدر کے پاس ایک طرح سے وسیع اختیارات ہوتے ہیں۔ امریکی صدر کے اختیارات کا ذکر کرتے ہوئے فرینکلن ایشر لکھتے ہیں:

”(امریکی) صدر پارلیمنٹ کے ہاتھ میں کٹھ پتلی نہیں ہے بلکہ اسے اختیارات حاصل تھے۔ صدر کی منظوری اور دستخطوں کے بغیر پارلیمنٹ کسی قانون کو نافذ نہیں کر سکتی۔ صدر کو اختیار تھا کہ وہ کسی قانون کو رد کر دے یا دوبارہ غور کے لئے پارلیمنٹ بھیج دے۔۔۔بری اور بحری بیڑے کی کمان بھی صدر کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ اسے اختیار ہوتا تھا کہ جس ملک سے چاہے معاہدہ کرے۔۔اسی طرح سینیٹ کی منظوری سے وہ سپریم کورٹ کے ججوں، سفیروں اور دوسرے اعلیٰ افسروں کا تقرر کر سکتا تھا۔۔۔ دستور بناتے وقت جب صدر کے فرائض مقرر کر رہے تھے تو وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کا صدر حکومت کا برائے نام سربراہ نہیں ہو گا بلکہ حقیقی معنوں میں صدر حکومت ہو گا۔“(۳)

جبکہ پاکستان میں ریاست کا سربراہ صدر جبکہ حکومت اور انتظامیہ کا سربراہ وزیر اعظم ہوتا ہے۔ پاکستان میں اسی سبب صدر برائے نام اختیارات کا حامل ہوتا ہے جبکہ حقیقی طاقت کا محور وزیر اعظم ہوتا ہے۔

مقننہ کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو امریکہ اور پاکستان دونوں میں دو ایوانِ نمائندگان ہیں ایک ایوانِ زیریں جبکہ دوسرا سینیٹ۔(۴) امریکہ میں ایوانِ نمائندگان کو کانگریس جبکہ پاکستان میں اسے قومی اسمبلی کا نام دیا گیا ہے۔ مقننہ کا کام چونکہ قانون سازی ہوتا ہے اسی سبب یہی دونوں ادارے پاکستان اور امریکہ میں قانون سازی بھی کرتے ہیں۔ اختیارات کے اعتبار سے پاکستان میں قومی اسمبلی جبکہ امریکہ میں سینیٹ زیادہ مضبوط ادارہ ہے۔ امریکہ میں ایوان زیریں کے نمائندے دو سال جبکہ پاکستان میں پانچ سال کے لئے منتخب ہوتے ہیں۔(۵) جبکہ امریکہ اور پاکستان دونوں میں سینیٹر چھ چھ سال کے لئے منتخب ہوتے ہیں۔ امریکہ اور پاکستان دونوں میں سینیٹ میں صوبوں یا ریاستوں کو برابر نمائندگی دی جاتی ہے جبکہ کانگریس اور قومی اسمبلی میں صوبوں یا ریاستوں کی نمائندگی عوام کی آبادی کے تناظر میں رکھی گئی ہے۔ یہی بنیادی وجہ ہے کہ امریکی سینیٹ وفاقی وحدتوں کی آزادی اور حقوق کا ضامن ہے جبکہ پاکستان میں سینیٹ ربڑ اسٹمپ ہونے کے سبب متحرک کردار ادا نہیں کر پاتی نتیجتاً قومی اسمبلی میں عددی اکثریت والا صوبہ زیادہ اختیارات اور وسائل کا حامل بن جاتا ہے۔ یوں کمزور اکائیوں کو وفاق سے ہمیشہ گلہ ہی رہتا ہے کہ ان کو ان کے حق سے محروم رکھا جا رہا ہے۔ ایسے میں انار کی جنم لینے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ بقول سلمان عابد:

”ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہمارا مرکز، جس کا کام چاروں اکائیوں کو مضبوط بنانا اور ان کو اپنے ساتھ ملائے رکھنا تھا، عملاً ناکام ہوا ہے۔ جب لوگ ریاست کے بارے میں یہ کہتے ہیں

کہ یہ صرف اسلام آباد اور پنجاب کی نمائندگی کرتی ہے تو یہ اہم اعتراض ہے اور اس سے زیادہ سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ ریاست جب فریق بنا جائے اوراس کی بعض اکائیاں اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوں یا اس پر شدید تحفظات رکھتی ہوں، تو یہ ایک بڑالمحہ فکریہ ہوتا ہے۔"(٦)

امریکہ میں وفاقی، ریاستی اور مقامی تینوں طرز کی حکومتیں منتخب ہوتی ہیں اسی سبب عوام کو جوابدہ بھی ہوتی ہیں جبکہ پاکستان میں وفاقی اور صوبائی حکومتیں تو کسی قدر عوام کو جوابدہ ہوتی ہیں لیکن مقامی حکومتوں کا نظام پاکستان میں پروان نہیں چڑھ سکا۔ یہی وجہ ہے وسائل اور اختیارات کی نچلے طبقے تک رسائی نہ ہونے کے برابر ہے۔

ریاست کا تیسرا اہم ستون عدلیہ ہے۔عدلیہ قانون کو پرکھنے اور انصاف فراہم کرنے کا مجاز ادارہ ہے۔امریکہ میں عدلیہ بعض معاملات میں سپریم حیثیت کی حامل بن جاتی ہے بالخصوص جب مختلف اداروں میں اختیارات اور حدود کا اختلاف عمل میں آ جائے ۔یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں عدلیہ زیادہ بااختیار ہے۔(۷) پاکستان میں ایک زمانے تک عدلیہ کو نمایاں مقام حاصل تھا لیکن "نظریہ ضرورت" کے سبب عدلیہ نے اپنا وقار مجروح کیا۔ اسی سبب سپریم حیثیت کی حامل ہونے کے باوجود پاکستان میں عدلیہ اب متنازع بن چکی ہے۔

اگر دونوں ملکوں کے آئین کی بات کی جائے تو اس میں بھی واضح فرق موجود ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا آئین نہایت جامع ہے۔ وفاقی طرز کے اس آئین میں ہر ادارے کی حدود قیود اور اختیارات وضع کر دیے گئے ہیں۔ اس آئین کے سات بنیادی آرٹیکل ہیں جس میں دو صدیاں گزر جانے کے باوجود بھی صرف ستائیس ترامیم ہوئی ہیں۔ یہ آئین ۱۷۸۷ء میں منظور کیا گیا۔ اس کے بالمقابل پاکستان کا آئین ۱۹۷۳ء کی تیسری کوشش میں تکمیل کو پہنچا۔ پاکستان کا آئین بہت مفصل ہے جس میں ۲۸۰ آرٹیکل، ۱۲ ابواب اور چھ شیڈول ہیں۔ اس میں ہر ادارے کی حدود تو متعین کی گئی ہیں لیکن ان پر عمل پیرا ہونے میں ادارے اکثر پس و پیش سے کام لیتے ہیں۔ امریکی آئین سیکولر بنیادوں پر استوار ہے جہاں ہر کسی کو اپنے مذہب پر عمل پیرا ہونے کا اختیار ہے جبکہ پاکستان کا آئین بھی مذہب کی آزادی دیتا ہے لیکن اس کا آئین اسلامی رنگ کا حامل ہے جہاں حاکمیت اعلیٰ صرف خدا تعالیٰ کو حاصل ہے اور آئین کی تشکیل میں بھی اسلامی اصولوں کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

آج کے موجودہ دور میں امریکہ جمہوری، معاشی، معاشرتی اور عسکری حوالے سے ایک سپر پاور ہے جبکہ پاکستان ہنوز اپنی بقا کی جنگ اور چومکھی لڑائی لڑ رہا ہے۔ اسی لئے دونوں کی سیاست کا کسی طور موازنہ ممکن نہیں۔ امریکہ کا اثر رسوخ پوری دنیا پر چھایا ہوا ہے اور دنیا کے کونے کونے تک اس کی سفارتی کاروائیوں کی ایک تاریخ ہے۔ امریکہ اقوام عالم یعنی یو۔این کا بانی اور سلامتی کونسل کا مستقل رکن ہے۔ اس کو ویٹو کی طاقت میسر ہے جس سے وہ کسی بھی معاملے میں اپنی اجارہ داری کا ثبوت فراہم کر سکتا ہے۔ اقوام عالم کے زیادہ تر ادارے جیسے آئی۔ ایم۔ ایف، ورلڈ بینک، ڈبلیو۔ ایچ۔ او، اور ڈبلیو۔ ٹی۔ او وغیرہ پر اس کا کنٹرول ہے۔

جبکہ پاکستانی سیاست ہنوز طفلانہ مرحلے میں ہے۔ تقسیم کے بعد آدھے سے زیادہ وقت اس پر آمروں نے حکومت کی ہے۔ ہمارے ادارے کمزور ہیں۔ ہماری سرحدوں پر غیر یقینی کی سی صورتحال ہے جس کی وجہ سے ہمارے بجٹ کا زیادہ تر حصہ دفاع کی نظر ہو جاتا ہے۔ کمزور پالیسیوں اور کرپشن کے سبب دنیا میں ہماری جگ ہنسائی ہوتی ہے۔ ایسے میں امریکہ اور پاکستان کے سیاسی امتیازات صرف قانونی موشگافیوں اور انتظامی ڈھانچے کی حد تک موقوف ہیں۔

ب۔ سیاسی عالمگیریت کے عام آدمی کی زندگی پر اثرات:

عالمگیریت یا گلوبلائزیشن آج کے دور میں صرف ایک اصطلاح کی حد تک محدود ہو کر نہیں رہ گئی بلکہ اس کا دائرہ کار زندگی کے ہر شعبہ ہائے زندگی تک پھیل چکا ہے۔ سیاست بھی اس کے پھیلاؤ میں لازم وملزوم کی سی حیثیت کی حامل ہے بلکہ بہت سے معنوں اور حوالوں سے سیاست گلوبلائزیشن کا سُرخیل ہے۔ عالمگیریت کی اساس سرمایہ داری اور اوپن مارکیٹ ہے۔ یہ دونوں مقاصد بدونِ سیاست خام ہیں۔ سرمایہ داری یا عالمی مارکیٹ اگر سیاست کے بغیر عالمگیریت کو پھیلانے کی کوشش کرے گی تو ہر ملک میں بغاوت جنم لے گی، عمل کا رد عمل آئے گا، لوگ ایسی تبدیلی کو قبول نہیں کر پائیں گے۔ ایسے میں مارکیٹ یا سرمایے کا تحفظ اور پھیلاؤ سیاسی حوالے سے ہی ممکن ہے۔

عالمگیریت نے انسان کو ہر حوالے سے اپنے شکنجے میں کر قید کر لیا ہے۔ یونہی سیاسی طور پر بھی اس کے پھیلاؤ اور اثر ورسوخ کی ضرورت پیش آئی۔ ایسے میں سرمایہ داروں نے سیاستدانوں کو اپنا مطیع بنانا اور سیاسی طور پر عالمگیریت کی بنت کاری کا نظریہ پیش کیا۔ سرمایہ داری کے حوالے سے شاید عالمگیریت اتنی جلدی اپنا اثر نہ بنا پاتی لیکن سیاسی عالمگیریت نے ایک عظیم انقلاب کے لئے بنیادیں فراہم کیں۔ ایسے میں سیاسی چالوں کا

ایک جال پھیلایا گیا۔ سیاسی عالمگیریت فقط سرمایہ داری کی ترقی کا کوئی آلہ نہیں ہے بلکہ ایک ذہنیت ہے جو پوری دنیا پر کنٹرول کرنے کی عکاسی اور ترجمانی کرتی ہے۔

"گلوبلائزیشن کا پہلا ہدف اور نشانہ میدان سیاست ہے جس کا مقصد ہے کہ دنیا کی تمام قوموں کو امریکی نظام اور قوت کے سامنے سرنگوں کر دینا۔ دنیا کی تمام حکومتوں کو اپنی مرضی کے مطابق چلانا اور ان پر طرز حکومت کو تھوپ دینا تاکہ دنیا بھر میں امریکی مفادات کا تحفظ ہو سکے۔" (۸)

چونکہ منصوبہ ساری دنیا کو اپنا مطیع بنانا ہے اسی سبب عام آدمی کا اس سے متاثر ہونا اٹل ہے۔ سیاسی عالمگیریت بہت سے حوالوں سے عام آدمی کی زندگی کو متاثر کر رہی ہے۔ اس کی سب سے عام فہم شکل شدت پسندی، دہشت گردی، جنگ و جدل، تخریب کاری اور مخاصمت کے عالمی حوالے سے بڑھتے ہوئے واقعات ہیں۔ یہ کوئی اتفاق کی بات نہیں ہے کہ ہر وہ ملک یا سیاسی طاقت جو عالمی اجارہ داری کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے جلد یا بدیر وہ طرح طرح کی مشکلات میں گرفتار ہو کر یا گھر چلی جاتی ہے یا کسی نہ کسی سیاسی طاقت کے ہاتھوں گھر بھیج دی جاتی ہے۔ سیاسی عالمگیریت کے حصول کے لئے پہلے ایک سیاسی جماعت کی مدد کی جاتی ہے، پھر مطالبات نہ ماننے پر کسی دوسری سیاسی جماعت کو کھڑا کر دیا جاتا ہے یا وہاں کسی ڈکٹیٹر کی حمایت سے سیاسی بساط ہی پلٹ دی جاتی ہے۔

مستحکم ملکوں میں دہشت گردوں کی مدد کرنا، انہیں اسلحے سے لیس کرنا اور متمدن ملکوں کو تہہ و بالا کر کے اپنے مقاصد حاصل کرنا آج کے دور میں ایک عام سی بات ہے۔ عراق، شام، لیبیا، ایران، شمالی کوریا، سوڈان تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ ان سب کا براہ راست اثر عام آدمی کی زندگی پر پڑا۔ شدت پسندوں نے عام آدمی کا جینا دوبھر کر دیا۔ حکومتوں کی ادلی بدلی سے ملک کے معاشی حالات ابتر ہوئے، مہنگائی نے عام آدمی کا جینا دوبھر کر دیا، اولاد کی تعلیم و تربیت سفید پوش طبقے کے لئے آج سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ ملکوں کو ثانوی مسائل میں اس قدر الجھا دیا جاتا ہے کہ وہ اصل مسائل کی طرف توجہ کرنے کے قابل ہی نہیں رہتے۔ شدت پسندی میں اضافے کی وجہ سے حکومتیں، بجٹ کا ایک وافر حصہ عسکریت پسندوں سے نمٹنے کے لئے رکھ چھوڑتی ہیں۔ ایسے میں ترقیاتی، تعلیمی اور صحت سے متعلقہ مسائل دگرگوں صورتحال اختیار کر جاتے ہیں۔

سیاسی عالمگیرت کی ایک شکل قرضوں کی لت ہے۔پہلے ملکوں کی معیشت بگاڑی جاتی ہے، پھر انہیں اپنا دست نگر بنایا جاتا ہے۔ آسان شرائط کا بول کر قرضہ کے نشے کی عادت ڈالی جاتی ہے، جب ملک قرضے لینا شروع کر دیتا ہے تو عالمی طاقتیں ایسے ملکوں کی معاشی و داخلی پالیسیاں اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ایسے ملکوں کی معیشت کو تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔ آئی ایم ایف براہ راست سیاسی عالمگیریت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ایسے میں بھی عام آدمی کا نقصان سب سے زیادہ ہوتا ہے کیونکہ حکومتی عہدیدار یہ قرضہ بھی اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر لیتے ہیں اور یہ قرضہ بھی عام آدمی پر لگ نہیں پاتا۔الٹا مزید ٹیکس یہ کہہ کر لگایا جاتا ہے کہ پرانا قرض اتارنے کے لئے یہ ضروری ہے۔ایسے میں غریب اور پسا ہوا طبقہ اپنے بچے بیچنے کی حد تک مجبور ہو جاتا ہے۔یوں اگر کہا جائے کہ دراصل مقامی حکومتیں ہی سیاسی عالمگیریت کی راہ ہموار کر رہی ہوتی ہیں تو زیادہ غلط نہیں ہو گا:

> ”بدقسمتی سے حکومتیں ان پالیسیوں کا حصہ ہوتی ہیں جن کے نتیجے میں بالآخر عام انسان ہی خسارے میں رہتا ہے۔سرمایہ دارانہ نظام میں حکومتوں کی حیثیت سرمایہ داروں کو سہولتیں مہیا کرنے والے ادارے کی ہوتی ہیں جس کا کام استحصالی نظام کی خدمت کرنا ہوتا ہے۔اگر کہیں کوئی حکومت ان پالیسیوں کو نافذ کرنے میں رکاوٹ بنتی یا سستی کا مظاہرہ کرتی ہے تو اسے ختم کر دیا جاتا ہے۔“(۹)

ایسے میں بعض ملک ایسے بھی ہوتے ہیں جو سیاسی عالمگیریت کی اس ریشہ دانیوں کو سمجھ جاتے ہیں اور ان کے چنگل سے بچ نکلنے کی اپنی سی سعی کرتے ہیں۔ایسے ملک بھی بالآخر اذیت میں دوچار کر دیے جاتے ہیں۔ان کا گھیراؤ عالمی اقتصادی پابندیوں سے کیا جاتا ہے۔یوں وہ ملک ،نہ برآمدات کا متحمل ہو پاتا ہے اور نہ درآمدات کے لئے کسی ملک کو راضی کر پاتا ہے۔سخت اقتصادی پابندیوں سے ساری دنیا کا ناتا ایسے ممالک سے کاٹ دیا جاتا ہے اور ایسے میں وہ ملک مسکینی اور بے بسی کی مجسم تصویر بن جاتا ہے۔ایران، وینزویلا، شمالی کوریا وغیرہ اسی حالت کی مظہر ہیں۔ایسے ملکوں کی عوام مہنگے داموں چیزیں خریدنے پر مجبور ہوتے ہیں وہ نامور غیر ملکی یونیورسٹیوں سے اچھی تعلیم حاصل نہیں کر پاتے اور عالمی دنیا سے کلیتاً کٹ کر رہ جاتے ہیں۔یہ سراسر سیاسی عالمگیریت ہی کا شاخسانہ ہے۔

ان سب باتوں میں سب سے عجیب بات یہ ہے کہ یہ سب ممالک اقوام متحدہ کے چارٹر اور انسانی

حقوق کے دلدادہ اور مبلغ ہیں۔ وہ دنیا کو اخلاقیات، بھائی چارے، عالمی انسانیت کا درس دیتے ہیں۔ یہ ملک جانور پر ہلکا سا ظلم برداشت نہیں کر پاتے لیکن پوری قوم کو ملیا میٹ کر کے رکھ دینے میں کوئی ہرج نہیں سمجھتے۔ ہیروشیما اور ناگا ساکی آج بھی ان نام نہاد اخلاقیات کے نام لیواؤں کو منہ چڑا رہے ہیں۔ امریکا اور مغرب ان سب چیزوں کا مظہر ہے۔ امریکہ عالمی طاقت بنا ہی اسی مظالم کے سر ہے۔ آج امریکہ طاقت کا واحد سرچشمہ ہے۔ طاقت کے نشے میں ہر وہ اس کے لئے آسان ہے جو سرد جنگ میں سوچ کر کرنا پڑتا تھا۔ سیاسی عالمگیریت نے طاقت کے توازن کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ اس سے غریب ملک بہت متاثر ہوئے ہیں۔ پہلے غریب ملک دو طاقتوں کے سایے میں اپنے حقوق حاصل کر لیتے تھے لیکن آج امریکہ نے غریب عوام سے روٹی تک چھین لی ہے۔

> ''امریکہ کا واحد عالمی طاقت ہونا' ظاہر بین نگاہوں میں چاہے ایک حقیقت ہو، لیکن اس واحد سوپر پاور کا دوسروں پر غلبہ حاصل کر لینا اور ان کو اپنا تابع مہمل بنا لینے کی کوشش وہ خطرناک کھیل ہے' جس نے عالمی بساط کو تہ و بالا کر دیا ہے، غلبہ اور جہانگیری کے یہی وہ عزائم ہیں جن کے حصول کے لئے خارجہ سیاست کے ساتھ فوجی حکمت عملی اور معاشی اثراندازی کا ایک عالم گیر جال اور جاسوسی اور تخریب کاری کا ایک ہمہ پہلو نظام پوری دنیا کے لئے قائم کیا گیا ہے اور اسے روز بروز زیادہ مؤثر بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔''[۱۰]

سیاسی عالمگیریت نے طاقت کا توازن بگاڑ دیا ہے۔ دنیا دو پولر سے یونی پولر ہو گئی ہے۔ افغانستان میں افغانی قوم کو امریکہ نے جس بے دردی سے استعمال کیا ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ پہلے انہیں خود اسلحہ دے کر روس کے خلاف بطور طالبان استعمال کیا اور جب مقصد پورا ہو گیا اور افغانستان آنکھوں میں کھٹکنا شروع ہوا تو انہیں طالبان کو عالمی دہشت گرد قرار دے کر افغانستان پر دھاوا بول دیا۔ آج عام افغانی دربدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ ہر افغان خاندان اپنے کسی نہ کسی پیارے کو اس جنگ میں کھو چکا ہے۔ عام آدمی امن کے لئے ترس رہا ہے۔ لیکن سیاسی عالمگیریت امن کی راہیں بنانے کی بجائے مزید بگاڑ رہا ہے۔ سیاسی عالمگیریت کی یہ شکل ہمیں اسلامی ممالک میں زیادہ زور و شور سے جاری نظر آتی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ سیاسی عالمگیریت کی اصل جنگ صرف مسلمانوں کے خلاف ہی ہے۔ کیونکہ روس کے بعد امریکہ اور سیاسی عالمگیریت کے نام لیواؤں کو اپنا اسلحہ بیچنے کے لئے کسی نہ کسی دشمن کی ضرورت ہے۔

بقول سیموئیل ہنگٹن:

> ''سوویت یونین کے سقوط کے بعد مغرب کو ایک نئے دشمن کی ضرورت ہے، کیوں کہ جنگ کبھی نہیں رکے گی۔ خواہ ہتھیار زنگ آلود ہو جائیں اور ملکوں کے درمیان معاہدات ہو جائیں، ہاں شاید یہ ہو سکتا ہے کہ عسکری جنگ نہ ہو لیکن مغربی خیمے میں، جس کی قیادت امریکہ کر رہا ہے اور دوسرے فریق کے درمیان مسلسل تہذیبی جنگ چلتی رہے۔''(۱۱)

یہ عالمگیریت کی ایک نہایت سادہ اور عام فہم شکل ہے۔ دنیا میں سیاسی عالمگیریت کے نام لیوا ایسی ایسی سازشوں میں مصروف ہیں جس کا سوچنا بھی محال ہے۔ دنیا پر اجارہ داری کی دوڑ ہے جس میں سب ننگے دوڑ رہے ہیں۔ عام آدمی کا نہ پہلے کسی نہ سوچا نہ ہی اب کوئی سوچ رہا ہے۔ لیکن دنیا یہ بھول جاتی ہے کہ طاقت کے مرکز پر نہ ہمیشہ اسکندر اعظم متمکن رہا نہ دارا نہ چنگیز خان۔ برطانیہ جس پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا آج خود کی بقا کے لئے دوسرے ممالک سے مذاکرات کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج عالمگیریت کے خلاف بھی ایک نئی لہر چلنی شروع ہو گئی ہے۔ آج دنیا میں مقامیت اور قومیت کی جنگ شروع ہو چکی ہے۔ ''دنیا گلوبلائیزشن (عالم گیریت) سے گلوکلائیزیشن (مقام گیریت) کی طرف بڑھ رہی ہے، یعنی مقامی مسائل اپنے اثرات کے اعتبار سے عالمی بنتے جا رہے ہیں۔''(۱۲) سادہ سا مطلب یہ ہے کہ چھوٹے مسائل اپنا دائرہ اثر بڑھاتے بڑھاتے عالمگیر صورت میں دنیا کے لئے خطرہ بنتے چلے جا رہے ہیں۔ اس صورت حال میں بھی اصل متاثر عام آدمی ہی نے ہونا ہے لیکن عام آدمی کا نہ پہلے کسی نے سوچا ہے نہ ہی آئندہ کوئی سوچے گا۔

ج۔ حاصل گھاٹ میں سیاسی عالمگیریت کی عکاسی:

بانو قدسیہ کا ناول ''حاصل گھاٹ'' اسی سیاسی عالمگیریت کا بہترین عکاس بھی ہے۔ جس میں مصنفہ نے عالمی سطح پر رونما ہونے والے سیاسی واقعات اور اس کے نتیجے میں برپا ہونے والے نتائج و اثرات کو ناول کا حصہ بنایا ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ جنگِ عظیم دوم کے بعد مغرب کا علاقائی قومیت پن کس طرح مفاد پرستی کی کشمکش کا باعث اور قتل و غارت کا زینا ثابت ہوا۔ نتیجتاً جرمنی بھی دولخت ہوا۔ اس طرح دنیا میں امریکہ اور روس دو بڑی قوتوں کی حیثیت سے نمودار ہوئیں۔ اگرچہ دونوں مملکتیں ایک ہی تہذیب و تصورِ حیات کی علمبردار تھیں مگر روس کمیونزم جبکہ امریکہ کیپٹیلیزم (سرمایہ داری) کا داعی تھا۔ دونوں طاقتوں کے ہاں فرق صرف مفادات، دائرہ اثر اور طریقِ معیشت کا تھا۔ کیونکہ ایک کے ہاں آزاد معیشت رائج تھی تو دوسرے کے

ہاں پابند معیشت کا تجربہ ہو رہا تھا۔یوں ساری دنیا کیپٹلزم اور کمیونزم کے دو نظریاتی بلاکوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ تب ہر بلاک کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ ممالک کو اپنا حامی بنا کر اپنے زیرِ اثر لائے۔ ان حالات میں بعض ممالک نے امریکہ کی، بعض نے سوویت یونین کی حمایت شروع کر دی اور دونوں ممالک (امریکہ اور روس) کے درمیان سرد جنگ شروع ہو گئی۔ کیونکہ جنگِ عظیم دوم کے بعد جب دنیا میں اس وقت کوئی اور طاقت ان کی حریف نہ رہی تو ان کی باہمی مسابقت کا اصل میدان، دائرہ اثر میں وسعت کی کوشش اور اپنے اپنے قومی مفادات بن گیا۔

> ”۱۹۱۷ء میں جب روس نے اشتراکی نظامِ حکومت اپنایا اور دنیا میں دو بہادر سپر پاورز کا وجود ابھرنے لگا تو جلد ہی دنیا نے دیکھا کہ ساری دنیا کو ان دو بہادروں نے بندر بانٹ کے فلسفے کے تحت ، اپنے اپنے لئے مارکیٹ تلاش کرنے کے سلسلے میں اپنی حاکمیت جتانے کی خاطر تھرڈ ولڈ کی اعانت شروع کر دی۔۔۔ امریکہ اور روس کے دیکھا دیکھی یورپ اور انگلستان بھی اس دوڑ میں کود پڑے۔ اب تھرڈ ولڈ میں اسلحہ ، دوائیں ، ناکارہ اور کارآمد ٹیکنالوجی کے بازار لگ گئے۔ ابھی ترقی یافتہ ممالک Sick Industries کے تصور سے ناآشنا تھے۔ اسی لئے رفتہ رفتہ اپنے دباؤ اور بہادری کے ذریعے ساری دنیا Zones میں بٹ گئی۔ اب کچھ امریکہ کے بیڑے تھے اور کچھ روس کے لوٹے۔“(۱۳)

مگر ۱۹۹۱ء میں جب روس کے اقتدار کے پرخچے اڑے اور دنیا میں طاقت کا توازن بگڑ گیا اور صرف امریکہ ہی دنیا کی عظیم طاقت کے طور پر ابھرا تو حالات کلیتاً بدل گئے۔ یوں اس دور میں امریکہ نے نیو ورلڈ آرڈر کو مرتب کرنے کا پروگرام بنایا اور اس آرڈر کے تحت دنیا کے بہت سے ممالک کو اپنی نہج پر ڈھالنے کی کوشش شروع کر دی جس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہونے لگا۔ لیکن اندر ہی اندر امریکہ کو ایک ایسی طاقت کا خوف بھی تھا جو کسی بھی وقت امریکہ کے لئے خطرے کا باعث بن سکتی تھی۔ اور وہ طاقت صرف اور صرف اسلام کی طاقت تھی جسے وہ بنیاد پرستی یا اسلامک ”ایٹم بم“ کا نام دیتا ہے۔ کیونکہ امریکہ اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ جب تک عالمِ اسلام سے اللہ اکبر کی آذانیں بلند ہوتی رہیں گی اس وقت تک اس کی کبیریائی کے چھوٹے پندار کو خطرہ لاحق رہے گا۔

امریکہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ جس روز مسلمانوں کے اندر ایمان کی طاقت زور پکڑ گئی تو اس روز وہ مسلمانوں پر اپنا قبضہ برقرار رکھنے میں ناکام ہو جائے گا۔ اور یوں تیل کی دولت اس کے دستِ تصرف

سے نکل جائے گی تو پھر اس کی مادی ترقی اور قوت وطاقت کا یہ سارا طلسم ہوشربا ختم ہو جائے گا تو اس طرح اس کی دھونس اور دھاندلی کا سارا طمطراق بھی جاتا رہے گا۔ مگر اس خطرہ عظیم کے پیشِ نظر امریکہ کے بہادر جیالوں نے ہر مسلمان مملکت کے لئے الگ الگ پلان بنایا۔ جبکہ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ عالمِ اسلام کو اللہ تعالیٰ نے جن بے شمار نعمتوں مثلاً تیل، پٹرولیم، گیس، قیمتی معدنیات اور دیگر وسائل سے نوازا ہے وہ ساری دولت آج یہود وانصاریٰ کے قبضے میں ہے۔ خصوصاً عرب ممالک مشرقِ وسطیٰ سے پیٹرولیم اور اس کی مصنوعات نکالنے کے ٹھیکے اب یورپی اقوام کے پاس ہیں۔ حال ہی میں کویت، عراق جنگ کی آڑ میں سعودی عرب اور کویت کی تیل کی دولت امریکہ کے قبضے میں چلی گئی ہے۔ جبکہ دوسری طرف عراق میں حالیہ جنگ کے دوران امریکہ اور اتحادی ممالک نے قدرتی وسائل پر قبضہ کر رکھا ہے۔

یہ مشاہدہ ایک دو مثالوں کی حد تک محدود نہیں بلکہ پوری دنیا بالعموم اور اسلامی دنیا بالخصوص، عالمگیریت کے سیاسی جال میں پھنسی نظر آتی ہے۔ جیسے ایران، عراق، افغانستان، شام، لیبیا، سوڈان، الجزائر، بوسنیا اور کروشیا وغیرہ وغیرہ۔ مصنفہ کا مشاہدہ اس مضمن میں بہت گہرا ہے۔ دنیا کے وقوع پذیر ہونے والے سیاسی واقعات کا انہوں نے کھلی آنکھوں اور کھلے دماغ سے مشاہدہ کیا جس کا نچوڑ انہوں نے اپنے ناول ''حاصل گھاٹ''میں کچھ یوں پیش کرتی ہیں۔

''ایران اور عراق کی جنگ میں دو مسلم طاقتوں کو آپس میں لڑا کر دونوں طاقتوں کو کمزور کر دیا۔ ان طاقتوں کے دانت کھٹے کرنے کے بعد سعودی عرب کو یقین دلایا کہ اب عراق ان کی سالمیت کو دھچکا لگانے لگانے والا ہے۔ اس کے لئے کویت کی حکومت کو ایکشن پر اکسایا اور خود سعودی عرب میں اپنے جنگی وسائل لے کر ایسے بیٹھ رہا کہ ہلانا مشکل۔ سوڈان کو دہشت گرد بنا کر خانہ جنگی اس پر مسلط کر کے اسے تباہ کر دیا۔ پاکستان کی حکومتوں میں باہمی تنازعوں کو فروغ دے کر بدنظمی اور بدانتظامی میں مبتلا کر کے دولخت کر دیا۔ ترکی کو یورپ کی منڈی کا حصہ اس لئے نہیں بننے نہ دیا کہ وہ احساسِ کمتری کا شکار ہو کر امریکہ کے آگے کاسہ گیر رہے اور امریکہ کے لئے جاسوسی کرتا رہے۔ الجزائر میں ڈیمو کریسی کا پتا پھینکا اور جب دیکھا منڈا منٹلسٹ کامیاب ہو گئے تو یہاں فوجی راج قائم کر دیا گیا۔ افغانستان کو روس کی آدرشی تحریک ختم کرنے کے لئے استعمال کیا اور بعد ازاں احسان فراموشی کا ثبوت دیا۔ بوسنیا کو سربیا اور کروٹیز کے آگے پھینکا اور کچھ کرنے جوگا نہ چھوڑا۔''(۱۴)

چنانچہ روس کی شکست کے بعد عالمی حالات کے تناظر میں امریکہ خود کو بلاشرکت غیرے دنیا کی سپر پاور تصور کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایک سپر پاور ہونے کے ناطے امریکہ اب سمجھتا ہے کہ بظاہر اب دنیا کے کسی بھی ملک اور قوم میں اتنی طاقت اور ہمت نہیں کی اس کے سامنے چوں چرا کر سکے۔ کیونکہ امریکہ کی منظورِ نظر ہمیشہ صرف اپنا مفاد ہوتا ہے اور وہ اسلحہ کی ڈور میں خود سے آگے سے آگے نکلنا چاہتا ہے جس کی وجہ سے وہ غریب اور ترقی پذیر ممالک کو استعمال شدہ اور پرانا اسلحہ فراہم کرتا ہے۔ اس کا ایک فائدہ تو امریکہ کو یہ ہوتا ہے کہ غریب اور ترقی پذیر ممالک اس کے مقابلے میں کھڑے نہیں ہوسکیں گے اور دوسرا فائدہ یہ ہوتا کہ ان کی مارکیٹ بھی بڑھتی رہتی ہے۔ اور یوں ان کا اپنا اسلحہ خریدنے کے لئے پرانے اسلحے کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔ اس طرح وہ جدید سے جدید اسلحہ کی طرف گامزن رہتے ہیں اور بالخصوص جو غریب ممالک ہیں ایک طرح سے ان کے دستِ نگر رہتے ہیں اور ان سے ہمیشہ ایک دو قدم پیچھے رہتے ہیں۔

اسی طرح فوجی اور اقتصادی امداد کی فراہمی میں بھی امریکہ کا فائدہ ہی فائدہ ہے کیونکہ اس امداد کے بدلے میں وہ جس طرح سود پر سود حاصل کر رہا ہے اسے بھلا کیسے بند کر سکتا ہے۔ بہر حال ہتھیار بنانے اور اس کے بدلے میں تیل، اجناس اور خام مال حاصل کرنے پر ہی تو عالمی طاقتوں کی دال روٹی کا دارومدار ہوتا ہے۔ لیکن یہ مسلم دنیا پر ہے کہ وہ کب جاگتا ہے۔ آج اگر تمام مسلم ممالک اس بھید کا پالیں تو پھر دنیا کی کوئی بھی طاقت ان کا بال بیکا نہیں کر سکتی۔

> ''روس کی شکست کے بعد امریکہ نے مسلمان ملکوں میں اپنے اسلحہ کے مارکیٹ قائم کئے۔ وہ ترقی پذیر ملکوں کو ایسا اسلحہ بیچتا جو زیادہ Sophisticated نہ تھا۔ بہادر امریکہ کو علم تھا کہ جب کسی ملک میں اسلحہ ہوتا ہے تو وہ استعمال میں ضرور آتا ہے۔ پھر ہر مظلوم اسی اسلحہ کے ہاتھوں کبھی کبھی ظالم بھی بن جاتا ہے۔ دین دار گروہ تک اپنی حفاظت کے لئے اسی اسلحہ کا سہارا لیتے ہیں۔ سیاسی جماعتیں اپنی مضبوطی اسی اسلحے سے قائم کرتی ہیں۔ کمزور کو ان ہی ہتھیاروں سے طاقت ملتی ہے۔''(۱۵)

عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ جب بھی کوئی قوم یا ریاست دوسروں سے زیادہ طاقت یا پاور حاصل کر لیتی ہے تو وہ متکبر و مغرور ہو جاتی ہیں۔ اور اپنی اس طاقت کے نشے میں گم ہو کر وہ خود سے کمزور لوگوں یا ترقی پذیر ملکوں پر اپنا تسلط جمانے کے لئے جبر و ستم کی مرتکب ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ دنیا میں امن و امان تبھی قائم رہ سکتا ہے جب

طاقت میں توازن بر قرار رکھا جائے گا۔ ماضی میں اگر دیکھا جائے تو دو بڑی طاقتیں امریکہ اور روس جب ایک دوسرے کے مدِ مقابل تھیں تو دنیا واضح طور پر دو بلاکوں میں بٹ گئی جس میں ایک طرف امریکہ جبکہ دوسری طرف روس تھا۔ اس طرح طاقت میں کچھ توازن پیدا ہو چکا تھا جس کی وجہ سے دنیا ایک بڑی جنگ سے محفوظ رہی۔ لیکن آج کی دنیا سرد جنگ کے بعد کے دور سے گزر رہی ہے جس میں دنیا کی طاقت کا توازن بگڑ چکا ہے۔

لہذا جیسے ہی روسی بلاک ٹوٹا تو امریکہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن گیا جس کے باعث اس نے اکثر ممالک بالخصوص اسلامی ممالک کو طرح طرح سے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ دراصل امریکہ یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ ملکوں کے حالات خراب کرنے میں ایک بڑا کردار اسی اسلحے کا ہوتا ہے جسے وہ باقاعدہ پلان کر کے ترقی پذیر ملکوں کو ٹرانسفر کرتا ہے۔ کیونکہ اسی اسلحے کے ذریعے ہی بدامنی پھیلتی ہے اور اسی کے ذریعے دین دار گروہ اپنی حفاظت کرتے ہیں۔ اور اسی اسلحے کو بنیاد بنا کر وہ غدار اور جاسوس لوگ پیدا کرتے ہیں جو ملک میں فرقہ وارنہ فسادات پھیلانے کا باعث بنتے ہیں تا کہ وہ ملک مستحکم نہ ہو پائے۔ بالآخر طاقت میں توازن بر قرار نہ رہنے کی وجہ سے امریکہ اب خود سر، متکبر، جابر اور ڈکٹیٹر بن چکا ہے۔

> ''پھر اسی اسلحے کی برکت سے شہروں میں وارداتیں ہونے لگتی ہیں۔ گروہی، اجتماعی جھگڑے فروغ پاتے ہیں۔ ڈاکو، اٹھائی گیرے، دہشت گرد اسی اسلحہ کی بنا پر زیادہ جی داری کے مظاہرے کرتے ہی۔ ٹرینوں میں بم پھٹتے ہیں۔ کاریں چرائی جاتی ہیں، ڈکیتیاں ہوتی ہیں۔ ان تمام وارداتوں کی تفاصیل سپر پاور کے کارندے فتح مندی کے ساتھ اپنے مالکان تک پہنچاتے ہیں۔۔۔ ایسے ملکوں میں میر جعفر جیسے شخص تلاش کرنا بھی مشکل نہیں ہوتا۔ شک و خوف کی لرزاں شہریوں کو دو نظریوں ، دو پارٹیوں میں تقسیم کرنا کچھ بھی مشکل نہیں۔۔۔ مسلمان ملکوں کو کسی وقت بھی کوئی میر جعفر اپنی حرص کے باعث اسلحے کی فراہمی کے ہاتھوں خانہ جنگی میں ڈبو سکتا ہے۔ مسلمانوں کی زبوں حالی کسی وقت میرا ساتھ نہیں چھوڑتی اور میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔''(۱۶)

لہذا ان تمام واقعات کے پس پردہ جھانکا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ امریکہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ اگر وہ کسی ملک کا حقہ پانی بند کرتا ہے تو وہ ملک فاقوں سے مر جائے گا۔ اور اگر وہ کسی ملک کی امداد روک دے گا تو وہ ملک مہنگائی کے گرداب اور سیاسی اضطراب کے بھنور میں پھنس کر خود ہی فنا ہو جائے گا۔ اور اگر اس نے کسی ملک کو اپنا اسلحہ یا فاضل پرزہ جات نہ دیئے تو اس ملک کو اپنی بقا اور سلامتی کے لالے پڑ جائیں

گے۔اب اس میں کوئی شک بھی نہیں رہا کہ امریکہ کی یہ حیثیت بحال ہو چکی ہے اور وہ جب چاہے کسی بھی ملک کی حکومت کا تختہ الٹ دے اور جب چاہے اپنے کسی پسندیدہ گروہ یا جماعت کو تاج و تخت بخش دے۔ کیونکہ ساری دنیا اب اس کے استعماری شکنجہ میں ہے اور کسی کی یہ مجال نہیں کہ وہ اس کے اس شکنجہ کو توڑ کر آزاد ہو سکے۔ بظاہر چین کے علاوہ اب دنیا میں کوئی ایسی قوم نہیں رہی جو امریکی عزائم کی راہ میں مزاحم ہو سکے۔ ماضی میں صرف روس ہی اس کے مدِ مقابل تھا۔ مگر اب وہ بھی افغان مجاہدین کے لگائے ہوئے زخموں کو چاٹنے میں مصروف ہے۔ چنانچہ امریکہ کو اب اپنے ہمہ مقتدر ہونے کا زعم ہے جس کے باعث وہ یہ کہتا ہے کہ اب دنیا کی کوئی بھی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور یوں دنیا کی تمام قوموں کو اس تابعِ فرمان بن کر رہنا چاہیے۔ لہٰذا امریکہ کی یہی خواہش اب اس کی خارجہ پالیسی کے نمایاں خدوخال بن چکے ہیں۔

> ”یہ وہ ملک ہے جو آزادی دینے اور چھیننے کا داعی ہے۔ اپنی آزادی ثابت کرنے کے لئے وہ افغانوں کی آزادی سلب کر سکتا ہے۔ اپنی طاقت کا ثبوت پہنچانے کے لئے عراق کو تباہ کر سکتا ہے۔ وہ ترقی پذیر ملکوں کو انگوٹھا دکھا کر، گلہ دبا کر، مکا گھما کر اپنی شرائط پر قرض ٹھونس سکتا ہے اور پھر تباہ کرنے کے بعد تباہی سے بچا بھی سکتا ہے۔ یہ وہ اکیلی سپر پاور ہے جو زبردستی صحت مند معاشروں پر اپنے ایجاد کردہ علاج ٹھونس سکتی ہے۔“(۱۷)

دراصل روس کمیونزم اور سوشلزم کا پرچار کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے اسلامی ممالک (خصوصاً پاکستان اور افغانستان) میں بعض تنظیمیں مذہب کے نام پر پروپیگنڈا کر رہی تھیں کہ کمیونزم کے نظریات اسلامی نظریات سے متضاد و متصادم ہیں۔ کیونکہ مسلمان ممالک کمیونزم کو اپنی سلامتی کے لئے خطرہ تصور کرتے تھے۔ جس کے باعث کمیونزم کی بات کرنا بھی گناہ تصور کیا جاتا تھا۔ یوں اس بات کا فائدہ امریکہ کو پہنچا اور اس نے پاکستان اور بالخصوص افغانستان کی مذہبی تنظیموں کی حوصلہ افزائی شروع کر دی۔

یہی وجہ ہے پاکستان اور افغانستان صدقِ دل سے روس کی طرف دوستی کا ہاتھ نہ بڑھا سکے اور انہیں امریکی بلاک میں شامل ہونا پڑا۔ مگر جب سویت یونین (روس) نے افغانستان میں مسلح مداخلت کی تو پوری دنیا نے اس کی مذمت کی اور مطالبہ کیا کہ روس اپنی فوجیں واپس بلائے۔ بہر حال جب افغانستان کی نئی حکومت نے مخالفین کو کچلنے کے لئے روسی فوج کو وسیع پیمانے پر استعمال کیا تو اس دوران افغانی عوام جو ذہنی طور پر کیمونزم کو کفر سے بدتر سمجھتے تھے، پاکستان میں درآئے جنہیں ” افغان مہاجرین“ کا نام دیا گیا۔ جبکہ پاکستانی

حکومت نے انسانی اور اسلامی جذبے کے تحت انہیں پناہ دی۔ بانو قدسیہ چونکہ ان حالات سے آگاہ تھیں یہی وجہ ہے کہ ناول میں سیاسی عالمگیریت کے تناظر میں انہوں نے ایک کردار عبد گل کو متعارف کروایا ہے۔ عبد گل ایسی نسل سے تعلق رکھتا ہے جو مہاجرت کے سائے میں پلا بڑھا۔ وہ ان سب حالات کا عینی شاہد ہے۔

''میں اپنا تعارف کرادوں۔ میں پشتون افغانی ہوں اور میرا نام عبد گل ہے۔ میرا باپ اپنا خاندان لے کر پشاور میں پناہ گزیں ہوا۔ یہ تب کی بات ہے جب ہم امریکہ کی جنگ روس کے خلاف لڑ رہے تھے۔ میرا باپ امیر آدمی تھا اس لئے ہمیں پشاور میں کوئی دقت پیش نہ آتی۔۔۔ امیر آدمی کو کہیں بھی دقت پیش نہیں آتی، وہ امریکہ میں ہو یا پاکستان میں، افغانستان ہو یا وہ زندگی کے وار دولت پر جھیل لیتا ہے۔''(۱۸)

روس اور پاکستان کی مخالفت اس وقت کھل کر سامنے آئی جب افغان عوام نے روسی فوج کو اپنے ملک سے باہر نکالنے کے لئے جہاد کا آغاز کیا تو پاکستان نے اُن کی حمایت کی۔ افغانستان کی صورتِ حال کے بگڑنے کا اثر چونکہ پاکستان پر بھی پڑتا تھا، اس لئے پاکستان نے بھی روسی افواج کی مداخلت کی بھرپور مذمت کی۔ لہذا ۱۹۸۸ء میں اقوامِ متحدہ کی زیرِ نگرانی جینوا میں روس، پاکستان اور افغانستان سے واپس بلا لیں۔ بلا آخر جب اپریل ۱۹۹۲ء میں افغانستان میں مجاہدین کی حکومت قائم ہوئی تو کچھ عرصے بعد مجاہدین کے باہمی اختلاف کی وجہ سے ایک نئی صورتِ حال پیدا ہو گئی تو ۱۹۹۵ء میں اسلامی حکومت اور فقہ نافذ کرنے کے خواہاں افراد ''طالبان'' کے نام سے افغانستان میں ابھرے، جنہوں نے افغانستان کے بیشتر حصے پر قبضہ کر کے افغانستان میں ایک اسلامی حکومت قائم کر دی۔

ان سب چیزوں نے افغانستان کے لبرل معاشرے کو شدید متاثر کیا۔ طالبان کی آمد سے قبل افغانستان میں مذہبی شدت پسندی نہیں تھی۔ ریاست کی زیرِ نگرانی سب اپنے اپنے اعمال میں آزاد تھے۔ لیکن طالبان کے آتے ہی (لبرلزم) کا جینا دوبھر ہو گیا، اندرونی اعمال کی درستگی کی بجائے ظاہری شریعت اختیار کی جانے لگی جس میں داڑھی رکھنا اور برقعہ پہننا لازمی ٹھہرایا گیا۔ عبد گل ان حالات کا تذکرہ کچھ یوں کرتا ہے۔

''میں ایک دوبار قندھار گیا، لیکن میں لبرل آدمی تھا۔ میرا قندھار میں دل نہ لگ سکا۔ وہاں طالبان کی حکومت تھی، جو احکاماتِ خداوندی کے پابند تھے۔ سب سے بڑی تکلیف مجھے وہاں داڑھیاں دیکھ کر ہوتی تھی۔ پھر عورتوں کے برقعے مجھے وحشت میں مبتلا کر دیتے۔ میری

دونوں بہنیں پشاور میں برقعہ نہیں پہنتی تھیں، لیکن قندھار میں انہوں نے بھی شٹل کاک برقعہ اختیار کر لیا تھا۔ میں لبرل تھا۔۔۔ لیکن برقعہ اور ڈاڑھی دیکھ کر نہ جانے کیوں غصے میں آجاتا۔"(۱۹)

در حقیقت امریکہ نے روس سے سرد جنگ کے دوران پاکستان کو بطور آلہ کار استعمال کیا۔ بات اصل میں یہ تھی کہ دونوں بلاک جنوبی ایشاء کی طرف بڑھنے کے خواہاں تھے۔ لیکن جیسے ہی روس نے افغانستان کی طرف قدم بڑھایا تو امریکہ نے اس پیش قدمی کو روکنے کے لئے پاکستان کو استعمال کیا اور جب معاہدہ جینوا کے تحت روسی فوجیں واپس چلی گئیں تو کچھ عرصے بعد بالخصوص ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو عالمی سیاست نے ایک نیا رنگ اختیار کیا۔ جب دہشت گردوں نے ہوائی جہازوں سے نیویارک میں واقع ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارت کو تباہ کر دیا اور واشنگٹن میں واقع پینٹا گون عمارت کو شدید نقصان پہنچایا تو امریکی صدر جارج بش نے اس کا سارا الزام "القاعدہ" کی تنظیم کے سربراہ اسامہ بن لادن پر عائد کر دیا۔

چنانچہ ۱۳ نومبر ۲۰۰۱ء کو امریکہ نے افغانستان پر حملہ کر کے افغانستان میں طالبان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور وہاں نئی حکومت قائم کر دی۔ عراق میں امریکی مداخلت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ یوں افغانستان میں امریکی مداخلت کے باعث پاکستان دہشت گردی کی آماج گاہ بن گیا اور افغانستان کی اندرونی چپقلشوں کا خمیازہ پاکستان کو بھی بھگتنا پڑا۔ سب سے اہم یہ کہ اس سب کا نتیجہ امریکہ کی سپر پاور اور اسلامی دنیا کی پسپائی کی صورت میں نکلا۔ سرد جنگ کے دور میں امریکہ اور روس کی باہمی چپقلش کی بدولت کوئی ملک کسی دوسرے ملک پر حملہ کرنے سے پہلے سوچتا تھا لیکن امریکی اجارہ داری نے اب اس کے دل سے کسی اور طاقت کا خوف بالکل نکال دیا ہے۔

"میں سوچتا رہتا کہ کمیونزم نے فیل ہو کر فرد کے لئے بڑی مشکل پیدا کر دی ہے۔ اب جمہوریت اور سرمایہ پرستی کے علاوہ اور کوئی مذہب قابلِ تقلید نہیں رہا۔۔۔"(۲۰)

نائن الیون واقعے کے بعد بین الاقوامی سیاست اور عالمی ماحول یکسر تبدیل ہو گیا۔ اس حادثے کی انتقامی کاروائیوں میں خصوصاً پاکستان کی سیاست، معیشت اور خارجہ پالیسی کو بہت زیادہ متاثر کیا گیا۔ اگرچہ یہ سانحہ پاکستان سے کوسوں دور رونما ہوا لیکن اس کے براہ راست اثرات پاکستان کو بھی سہنے پڑے۔ چنانچہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد امریکہ نے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا اور بالخصوص پاکستان میں اپنی ایجنٹوں

کے ذریعے دہشت گردی پھیلا دی، جس کے نتیجے میں پاکستان کو بہت جانی و مالی نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ جبکہ دوسری طرف مغرب میں یہودی لابی مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا کر کے سارا الزام مسلمانوں کے سر تھوپ دیتے ہیں کہ مسلمان دہشت گرد ہیں۔ جو کہ سراسر غلط اور مذہبی تعصب کو بنیاد بنا کر کیا جاتا ہے۔ بین الاقوامی سیاست میں یہودی، عیسائیوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے کردار کا اگر موازنہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ آج پوری دنیا میں مسلمان پس رہے ہیں۔ مسلمانوں پر دنیا کے ہر خطے میں ظلم و ستم ہو رہا ہے کشمیر میں بے گناہ مسلمان کو شہید کیا جا رہا ہے۔ فلسطین میں کتنے گھروں کے چراغ گُل کر دیے گئے ہیں۔ کتنے گھر جلا دڈالے گئے۔ بوسنیا میں مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا۔ عراق پر دوبارہ حملہ کیا گیا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ ہزاروں معصوم شہری القمہ اجل بن گئے۔ آج بھی آگ اور خون کا یہ کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اور اوپر سے یہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ مسلمان دہشت گرد ہیں۔

لیکن دنیائے کفر مسلمانوں کے جذبہ جہاد سے خوف زدہ بھی ہے۔ کافر چاہتے ہیں کہ مسلمان نہتے ہوں، ان پر اگر ظلم و ستم کے پہاڑ بھی توڑ دیئے جائیں تو بھی وہ آواز تک نہ نکالیں۔ اس کے برعکس اگر وہ ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں تو دہشت گرد قرار دیئے جاتے ہیں۔ اگرچہ دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ چور مچائے شور والی بات ہے۔ کیونکہ بنیادی طور پر نائن الیون کا واقعہ خود امریکہ میں یہودیوں نے رچایا تاکہ اس بہانے نے افغانستان پر قبضہ کر کے مسلمانوں کے وسائل کو لوٹا جائے۔ ذرا غور کریں تو دراصل یہ آج جو سب کچھ اس لئے ہو رہا کہ آج امتِ مسلمہ میں حقیقی اتحاد باقی نہیں رہا۔ اور ایک عالمی سازش کے تحت امتِ مسلمہ کو کمزور بنانے کا سلسلہ جاری ہے۔ کہیں مسلمانوں پر قدامت پسند ہونے کا لیبل لگایا جا رہا ہے اور کہیں مسلمانوں کو دہشت گرد ثابت کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ اسی سبب وہ مسلمان جو امریکہ یا مغرب میں مقیم تھے، اس رویے سے تنگ آکر لبرلزم کا روپ دھارنے لگے۔

> ''گیارہ ستمبر کے بعد پتہ نہیں کیوں میں نے نوکی چھوڑ دی۔ اور تاریخ پڑھنا شروع کر دی۔ میں بش کے ایکشن کا جواز ڈھونڈنا چاہتا تھا۔ میں نے ظلم کی تاریخ کو بہت مقام پر سٹڈی کیا بابا جان۔۔۔ کشمیر۔۔۔ بوسنیا، چیچنیا، جلیانوالا باغ، ہلاکو، نادر شاہ، چنگیز خان۔۔۔ کھال کھنچوانے کے واقعات، پنجروں میں بند قیدی۔۔۔ ہٹلر۔۔۔ ہیروشیما۔۔۔ اتنے سارے مظالم جو انسان پر ہو گزرے ہیں۔۔۔ انہوں نے مجھے اور لبرل کر دیا۔''(۲۱)

بوسنیا جنوب مشرقی ایشیا کی ایک مسلم ریاست ہے۔ بوسنیا کے اطراف میں کروشیا، سربیا اور مونٹی نیگرم واقع ہے۔ بیسویں صدی میں بوسنیا یوگوسلاویہ کا حصہ تھا جو کہ سویت یونین کے اثر کا ماتحت تھا۔ لیکن ۱۹۹۱ء میں جہاں دیگر سوویت ریاستوں میں آزادی کی تحریکیں پیدا ہوئیں ایسے ہی یوگوسلاویہ میں بھی ریاستوں نے آزادی کا دعویٰ شروع کر دیا۔ ایسے میں کروشیا اور سلووینیا نے اپنی آزادی کا اعلان سب سے پہلے کیا۔ اور چونکہ یہ عیسائی ریاستیں تھیں اس لئے ان کی آزادی کی یورپی یونین اور اقوامِ متحدہ نے فوراً قبول کر لیا۔

لیکن جب ۱۵ اکتوبر ۱۹۹۱ء میں بوسنیا نے اپنی آزادی کا اعلان کیا تو سربیا اور دوسری اقوام نے اس اعلان کو مسترد کرتے ہوئے بوسنیا پر حملہ کر دیا اور عوام کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ ایسے میں اقوامِ عالم خاموش تماشائی بنی رہی۔ حالانکہ بوسنیا ایک پُرامن قوم تھی جو کسی کا بُرا نہیں چاہتی تھی۔ ۱۵ مئی ۱۹۹۲ء میں جب اقوامِ متحدہ نے مداخلت کرنے کی کوشش کی اور کچھ حالات بہتر ہونا شروع ہوئے لیکن پھر بھی سربیا نے بوسنیا کے ۷۰ فیصد علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ۲۶ مئی کو نیٹو کی بمباری سے سربیا کو کافی نقصان پہنچا اور وہ پسپائی پر مجبور ہوا۔ یوں بوسنیا کی عوام کو سکھ کا سانس نصیب ہوا۔ مگر اس تمام صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے تو بوسنیا کی عوام کا بہت سا جانی و مالی نقصان ہو چکا تھا۔ اس دکھ کو بانو قدسیہ نے بھی محسوس کیا اور اپنے ناول میں اظہار کچھ اس طرح کیا:

> ''میں نے عبد گل کی طرف چور نگاہوں سے دیکھا۔ ایک مرتبہ اخبار میں اس کے ہم شکل آدمی کی تصویر چھپی تھی، وہ بوسنیا کا مجاہد تھا۔ اس کے ماتھے پر لمبے زخم کا نشان تھا اور اس پر جھکی ہوئی عورت نے سکارف سے اپنا بال ڈھانپے ہوئے تھے۔ اصغری جو گم سم سائے کی طرح سلیپر کھسکاتی کمروں میں بند چڑیا کی طرح گھومتی رہتی۔ اخبار اٹھا کر اس تصویر کو دیکھنے کے بعد بولی تھی۔۔۔ کتنے خوبصورت لوگ ہیں بوسنیا کے۔۔۔ لوگ ان غریبوں کے کیسے بیری ہو گئے۔۔۔ ہائے ہائے بڑا ظلم ہے بڑا ظلم۔''(۲۲)

بانو قدسیہ دورِ جدید کے اردو ادباء میں سیاسی حوالے سے بھی ایک نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ اس لئے ان کا ناول ''حاصل گھاٹ'' بھی اپنے دور کے سیاسی جذبات، سیاسی احساسات اور سیاسی رجحانات کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔ ہجرت کے مسائل کو بہت سے موضوعات کے تحت اردو ادب میں برتا گیا ہے۔ لیکن چونکہ پاکستان کا قیام ایک سیاسی المیہ بھی تھا اسی سبب قیامِ پاکستان اور اس کے ساتھ وسیع پیمانے پر تبادلہ،

آبادی، ہجرت اور قیامِ پاکستان سے پیدا ہونے والے مسائل اور ان مسائل کی الجھنوں اور پیچیدگیوں کو بانو قدسیہ کے ناول میں اہم پسِ منظر کی حیثیت حاصل ہے۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو معرضِ وجود میں تو آگیا لیکن اس نوایجاد ملک میں بے پناہ مسائل ابھر کر سامنے آئے۔ نظریاتی الجھنیں تھیں۔ تہذیبی و ثقافتی مسائل تھے۔ نئے اور پرانے خیالات کا ٹکراؤ اور حالات کے نئے تقاضے ہر طرف افراتفری کا دور تھا۔ گویا اس طرح قیامِ پاکستان کے بعد سیاسی عدم استحکام کی وجہ سے جو مسائل پیدا ہوئے بانو قدسیہ نے اپنے ناول میں ان کی بھی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ پاکستان کے قیام کے بعد انتشار، افراتفری، خود غرضی اور نفسانفسی کا دور دورہ رہا اس کے نتیجے میں حساس دل جس مایوسی اور کرب کا شکار ہوئے، بانو قدسیہ کے ہاں اس کا گہرا ادراک موجود ہے۔

> ''جب قیامِ پاکستان کے بعد ہم لاہور پہنچے تو ہمارے جیتے جاگتے مسائل تھے۔ روٹی پانی رہائش کا جھگڑا تھا۔ بچوں کی تعلیم، شادی، روزمرہ کے اخراجات ہر کمرے میں مسئلے ڈگڈگی بجاتے پھرتے تھے۔۔۔ لیکن اماں، ابا، دادی، دادا اندر سے شانت تھے۔ ان کے بھیتر ٹھنڈے فوارے چلتے تھے۔۔۔ وہ خوش تھے کہ انہوں نے پاکستان پالیا۔''(۲۳)

ویسے تو جنوبی ایشاء میں آزادی کی تحریکوں کے مختلف رنگ، سیاسی نظریات کے ٹکراؤ، سماجی رجحانات اور معاشی تحریکیں جیسے واقعات بہت سے فن پاروں کا موضوع رہے ہیں لیکن بانو قدسیہ نے ''حاصل گھاٹ'' میں نہ صرف ہمایوں فرید کے خاندان کی کہانی بیان کی ہے بلکہ اس امر کا تجزیہ بھی کیا ہے کہ عام افراد کی زندگی پر گرد و پیش میں رونما ہونے والے اپنے عہد کے سیاسی نظریات کے ٹکراؤ، سیاسی انتشار اور معاشی افراتفری کا کس قدر گہرا اثر پڑتا ہے۔

قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک پاکستان اور بھارت کے تعلقات خوشگوار خطوط پر استوار نہیں ہو سکے۔ دونوں ممالک کے درمیان کشمیر وجہ تنازعہ ہے۔ ان کشیدگیوں میں جہاں باہمی تنازعات کا کردار تھا وہیں سُپر طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ بانو قدسیہ کے نزدیک آج کل پاکستان کے انڈیا کے ساتھ جو حالات ہیں اور ان کے سبب اب پاکستان جن سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل سے دوچار ہے وہ ہم سب کے لئے دعوتِ فکر ہے۔ ملکی معیشت کمزور سے کمزور تر ہو رہی ہے۔ پاکستانی روپیہ اپنی قدر کھو رہا ہے، ڈالر اپنی قدر بڑھاتا چلا جارہا ہے۔، عالمی طور پر اب ہم شدت پسندوں کے دوست گردانے جانے لگے ہیں۔ ایسے میں

مصنفہ قاری کو حالات کا آئینہ دکھا کر اس بات پر ابھارتی ہیں کہ وہ سوچ بچار کرے کہ پاکستان کو اب ان مشکلات سے کس طرح اور کیسے چھٹکارا پانا ہے جو اسے ترقی کی راہوں پر لے جائے۔

علاوہ ازیں کراچی جو پاکستان کا معاشی ہب ہے وہاں امن کا نام و نشان نہیں رہا، جس کے سبب سرمایہ دار سرمایہ لگانے سے گھبرانے لگا ہے۔ بانو قدسیہ نے جب ناول لکھا تب کراچی میں شدت پسندی اور لسانی انتشار عروج پر تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ اس سب صورتحال سے مصنفہ شدید رنجیدہ ہے کیونکہ کراچی کے باہمی کراچی کو اب چھوڑ رہے ہیں۔ ناول میں ان کا تذکرہ کچھ یوں کرتی ہیں۔

> ''وہ۔۔۔ وہ عارف جس کے چہرے پر ماتا کے داغ تھے۔۔۔ جی بالکل وہی عارف۔۔۔ کراچی کے حالات ٹھیک نہیں۔۔۔ اس کے ایک بھائی کو کسی نے شوٹ کر دیا۔ لوگ دل برداشتہ ہو کر کراچی چھوڑ رہے ہیں۔۔۔ وہ بھی سمجھتا ہے اور میں بھی جانتا کہ ہمیشہ تجویز کام نہیں آتی۔ کبھی کبھی عجب طور پر خوش قسمتی آپ کے تعاقب میں ہوتی ہے۔۔۔ اب آپ ساری کشتیاں جلا دیں اباجی۔''(۲۴)

بانو قدسیہ ملکی سیاسی و سماجی حالات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں کہ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ملک میں جس طرح مہنگائی روز بروز بڑھتی چلی جارہی ہے۔ اس مہنگائی کی وجہ سے کس طرح عام آدمی کا جینا دوبھر ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ سے خاندان کی معاشی حالت بھی بگڑتی چلی جارہی تھی۔

اس طرح جب ''حاصل گھاٹ'' لکھا گیا اس وقت ہمارا ملک دہشت گردی کی لپیٹ میں تھا۔ خصوصاً روشنیوں کا شہر کراچی کا سکون غارت کرنے کے لئے طرح طرح کی سازشیں کی جارہی تھیں۔ کہیں مساجد تو کہیں امام بارگاہوں میں معصوم لوگوں کا خون بہایا جاتا تھا اور کہیں محبِ وطن افراد کو گولیوں کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ درحقیقت ایسا اس لئے ہورہا تھا کیونکہ دشمن ہمیں کمزور کر کے اپنے مذموم مقاصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے کبھی وہ مذہبی منافرت کو ہوا دیتا تو کبھی ہمیں آپس میں لڑانے کے درپے رہتا۔

> ''لاہور میں نظریاتی اختلافات کے ہاتھوں دوستوں میں بول چال بند ہو جایا کرتی تھی۔ لیگ اور پیپلز پارٹی نے خاندان کو دو پارٹیوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ڈرائنگ روم کی فضائیں ڈائیریا کے ہاتھوں بدبودار تھیں۔ قیمتیں فلک بوس ہورہی تھیں۔ ڈالر کی قیمت بڑھ جانے کے باعث کئی گھروں میں مالی استحکام ناممکن تھا اور لوگ ان مشکلوں کے ہاتھوں حیرت زدہ مرنے

مارنے کی سوچ رہے تھے۔"(۲۵)

غرض سیاسی تناظر میں بانو قدسیہ کا ناول "حاصل گھاٹ" ایک خوبصورت اور حالات سے باخبر ناول ہے۔ناول میں نائن الیون کے واقعات، اس کا پسِ منظر اور پیش منظر کو نہایت خوبصورتی سے عکس بند کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ امریکہ اور روس کی سرد جنگ، امریکہ کی سیاسی عالمگیریت، اس کے سیاسی عظائم اور نتیجتاً دنیا میں رونما ہونے والی سیاسی واقعات کو نہایت گہرے مطالعے سے ناول میں جگہ دی گئی ہے۔ناول صرف عالمگیر سیاسی حالات ہی کا عکاس نہیں بلکہ ناول میں پاکستانی سیاسی حالات، کراچی کی صورتحال، لسانی، مذہبی تعصب اور انڈیا کے ساتھ چلتی آرہی چپقلش کو بھی موضوعِ بحث بنایا ہے۔اور یہ سب باتیں مصنفہ کے گہرے سیاسی شعور کا پتہ بتاتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ فرہنگِ آصفیہ، مرتبہ مولوی سید احمد دہلوی، جلد سوم، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۱۴۱

۲۔ مقصود جعفری، ڈاکٹر، چراغِ افکار، ایس ٹی پرنٹرز گوالمنڈی، راولپنڈی، ۲۰۰۸ء، ص ۶۹

۳۔ فرینکلن ایشر، تاریخ امریکہ، مترجمہ احسن صدیقی / احسن حامد، حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۵۷ء، ص ۷۵

۴۔ صفدر حیات صفدر، آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان ۱۹۷۳ء، نیو بک پیلس، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۲۲

۵۔ ایضاً، ص ۵۴

۶۔ سلمان عابد، پاکستان میں جمہوریت کے تضادات، جمہوری پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۷۲

۷۔ Peltason,JD, About America(The constitution of the United States of America with explanatory notes)U.SDepartment of State, Washington,2004, Pg28

۸۔ شیخ عبد الرزاق، گلوبلائزیشن اور عالم اسلام، مکتبۃ الفہیم، یوپی، ۲۰۱۴ء، ص ۵۱۔۵۲

۹۔ خالد علوی، ڈاکٹر، اسلام اور عالمگیریت، دعوۃ اکیڈمی، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء ص ۱۲

۱۰۔ خورشید احمد، پروفیسر، امریکہ: مسلم دنیا کی بے اطمینانی (۱۱ ستمبر سے پہلے اور بعد)، انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، ص ۱۰۰

۱۱۔ سیموئیل ہنگٹن، امریکی مفادات اور امن، (مضمون) مشمولہ: گلوبلائزیشن اور اسلام از یاسر ندیم، دارالاشاعت، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۰۸

۱۲۔ ملیحہ لودھی، ڈاکٹر، جغرافیائی سیاست کی واپسی، العربیہ اردو، بتاریخ ۱۰ مئی ۲۰۲۰ء، بوقت ۷ بجے شام
http://urdu.alarabiya.net/ur/politics/2014/11/27/

۱۳۔ بانو قدسیہ، حاصل گھاٹ، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ایضاً ۱۴

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۵

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۵

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۵

۱۷۔ ایضاً، ص۲۸۲

۱۸۔ ایضاً، ص۲۸۳

۱۹۔ ایضاً، ص۲۸۵

۲۰۔ ایضاً، ص۲۸۷

۲۱۔ ایضاً، ص۲۸۸

۲۲۔ ایضاً، ص۲۸۷

۲۳۔ ایضاً، ص۲۱۸

۲۴۔ ایضاً، ص۱۶۰

۲۵۔ ایضاً، ص۱۹۴

باب چہارم

حاصل گھاٹ میں پاکستانی اور امریکی ثقافت کی علمی شناختیں

الف۔ سائنسی ایجادات اور ٹیکنالوجی کی بدولت تمدنی فرق و امتیاز:

i. معاصر زندگی کی تمدنی تبدیلیاں

تمدن کا مادہ ''مدن'' ہے اور یہ عربی الاصل لفظ ہے۔ جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے کہ تمدن بنیادی طور پر مدن سے متعلقہ ہے۔ یعنی شہر بسانا، شہروں میں سکونت اختیار کرنا، شہری زندگی کے لوازمات اور سماجی زندگی سب اس لفظ کے معانی میں شامل ہیں۔ لغت میں تمدن کی تعریف کچھ یوں ملتی ہے: ''شہر میں رہنا، انتظام شہر کا کرنا، پیشہ وروں کا ایک جگہ جمع ہونا۔''(۱) چونکہ تمدن میں انتظام شہر کے معنی بھی شامل ہیں اس لئے شہر کی سماجی زندگی، شہری بود و باش، نظامِ حیات، معاشرت کے طور طریقے اور خدوخال سب تمدن کی ہی ذیلی شاخیں گنی جائیں گی۔

تمدن کی بنیاد اگرچہ شہری زندگی سے ہے لیکن اب یہ اس سے بہت آگے بڑھ چکا ہے، بنیادی معنی ہنوز اس میں شامل ہیں لیکن اب سماج سے متعلقہ ہر مادی شے کا تمدن میں دخول ہے۔ تمدن کو بعض اوقات تہذیب کے معنوں میں بھی شامل کر لیا جاتا ہے لیکن یہ اس سے جدا حیثیت کا حامل ہے۔ تمدن کے دیگر معنوں اور تہذیب سے اس کے فرق کا ذکر کرتے ہوئے علی عزت بیگووچ لکھتے ہیں:

> ''تہذیب سے مراد مذہب کے انسان پر اثرات یا انسان کے اپنی ذات پر اثرات ہوتے ہیں جبکہ تمدن سے مراد فطرت پر انسان کی ذہانت کے اثرات اور بیرونی دنیا پر اس کی کارکردگی کے اثرات ہیں۔ تہذیب کا مطلب ہے انسان ہونے کا فن جبکہ تمدن سے مراد سرگرم رہنے، حکومت کرنے اور چیزوں کو مکمل بنانے کا فن ہے۔ تمدن تو زمانے کے ہمہ وقتی تبدیل ہوتے ہوئے عمل کا نام ہے۔ تمدن دراصل انسانیت بمقابلہ اشیا ہے۔''(۲)

گویا سادہ الفاظ میں تمدن مادیت اور اشیا سے متعلقہ ہر طرح کا علم، ہنر و عمل ہے۔ ہمارے بزرگان نے ابتدا میں جب پتھر اور لکڑی کی مدد سے ہتھوڑا بنایا تب ہی سے تمدن کا آغاز ہونا شروع ہو گیا۔ صدیوں کے بعد

صدیاں گزرتی گئیں اور انسان متمدن سے متمدن تر ہوتا چلا گیا۔ اس ضمن میں پہیے، کوئلے اور تیل کی ایجاد نے مہمیز کا کام کیا اور آج انسان سائنسی و ٹیکنالوجی کے دور میں سانس لے رہا ہے۔

سائنس یا جدید علم ہر دور میں اپنے اپنے وقت کے مطابق ظہور میں آتا رہا۔ رومیوں کا اپنا سائنسی علم تھا، یونانیوں کا ٹیکنالوجی کا اپنا میدان تھا اور مسلمانوں نے اس راہ میں اپنی اضافت کی۔ ایک طرح سے مسلمانوں نے جدید علم کے لئے راہیں استوار کیں اور انہیں کی کتابوں کے ترجمے نشاۃ ثانیہ کے بعد انگریزوں کے کام آئے۔ آج ہم جس جدید دنیا میں جی رہے ہیں، قدیم انسان نے شاید اس کا تصور بھی نہ کیا ہو۔ انسان نے جتنی ایک صدی میں ترقی کر لی ہے اتنی ہم نے ایک ہزار سال میں نہیں کی۔ مغربی مادی ترقی کا ذکر ارشد محمود کچھ یوں کرتے ہیں:

> ”مغرب کی صنعتی تہذیب سے دنیا کے کروڑوں لوگ متاثر ہو رہے ہیں۔ ان کے علم و ہنر میں کارہائے نمایاں ساری دنیا کے لئے انسپائریشن کا ذریعہ ہیں۔ ان کی سائنسی فتوحات انسانی مستقبل کا یقین ہیں۔ ان کی اعلیٰ سطحی معاشی و ثقافتی ترقی، جمہوری سیاسی نظام، تعلیم کا پھیلاؤ، وہ عوامل ہیں جو مشرق کی پسماندہ تہذیبوں کے لئے قابلِ رشک ہیں۔“ (۳)

پس انفارمشن ٹیکنالوجی اور سائنس نے دنیا میں زبردست تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ اس لحاظ سے موجودہ دور سائنس اور کمپیوٹر کے عروج کا دور کہا جا سکتا ہے۔ آج اگر اٹھارویں یا انیسویں صدی کا آدمی دوبارہ زندہ ہو کر دنیا میں واپس آ جائے تو وہ کبھی پہچان نہ سکے گا کہ یہ دنیا وہی ہے جس میں اس نے ایک عمر بسر کی تھی۔ خصوصاً اکیسویں صدی تو ایجادات اور دریافتوں کی صدی ہے۔ اکیلے کمپیوٹر نے ہی لوگوں کی زندگیوں پر کافی اثرات مرتب کئے ہیں۔ خصوصاً مغربی لوگ زیادہ تر اپنا سارا کام کمپیوٹر پر کرتے ہیں۔ یہ معلومات کے ساتھ ساتھ تفریح کا بھی ذریعہ ہیں۔

کمپیوٹر اور انٹرنیٹ ایسی ایجادات ہیں جس سے اب با آسانی فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ کیونکہ انٹرنیٹ نے دنیا کو ایک گلوبل ویلج بنا دیا ہے۔ اب دنیا کے دور دراز علاقوں میں بیٹھے لوگوں سے بھی انٹرنیٹ کی مدد سے پل بھر میں رابطہ ممکن ہو گیا ہے۔ اب اپنی مصنوعات کی تشہیر کے لئے زیادہ سفر کی ضرورت نہیں رہی، بلکہ انٹرنیٹ کے ذریعے آپ اپنی مصنوعات دنیا بھر میں متعارف کرا سکتے ہیں۔ آج کل آن لائن خرید و فروخت کا کاروبار وقت کے ساتھ بہت زیادہ ترقی کرتا جا رہا ہے۔ غرض بیسویں اور اکیسویں صدی نے انسان کے لئے بے

تحاشا سہولیات مہیا کر دی ہیں۔

ii. حاصل گھاٹ میں تمدنی امتیازات

''حاصل گھاٹ'' میں بانو قدسیہ نے مغرب اور مشرق میں رہنے والوں لوگوں کی تہذیبی و معاشرتی سوچ و تمدن پر جس خوبصورت طریقے سے روشنی ڈالی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مصنفہ نے اپنی تخلیقی جبلت کو محض ناول نگاری کے لئے استعمال نہیں کیا بلکہ اس میں مقصدیت کی روح کو سمو کر ایک مصلح قوم کا کردار بھی ادا کیا ہے۔ بانو قدسیہ نے ناول میں جہاں مغربی معاشرے کی تباہ کاریوں پر تنقید کی ہے تو وہیں ان کی سائنسی ترقی کی بدولت کامیابیوں و کامرانیوں کی دل کھول کر تعریف بھی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ خامیوں کی کھلے بندوں مذمت کر کے مسلمانوں کو راہ راست دکھائی ہے۔

آج اہلِ دنیا کی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کے لئے علم سائنس کے ذریعے جو مختلف سہولیات منظر عام پر آ رہی ہیں یہ سب سائنسی ایجادات اور جدید ٹیکنالوجی کے ہی کرشمے ہیں، جس کے باعث انسان کی تمدنی زندگی میں ایک عظیم انقلاب آیا ہے۔ مصنفہ کے بقول آج کا انسان محض پرانے تجربات کے بل بوتے پر زندگی نہیں گزار سکتا جب تک وہ بدلتے ہوئے ماحول سے مطابقت نہیں رکھتا۔ گویا مصنفہ کے اس نقطہ نگاہ سے ثابت ہوتا ہے کہ بانو قدسیہ مادی ترقی کی نہ صرف قائل ہیں بلکہ ان اقدار کو قائم رکھنے کے حق میں ہیں جو انسان کو ذہنی مسرت و سکون بخشتی ہیں۔ مصنفہ کے نزدیک یہ مغرب کی سائنسی اور مادی ترقی ہی ہے جس کی وجہ سے آج دنیا کی اکثریت روزی روٹی کمانے اور اچھا معیار زندگی اپنانے کے لئے مغربی ممالک کا رخ کرتی ہے۔

> ''ایسی ویسی نہ سوچو۔۔۔ ہجرت بھی اپنے اپنے ظرف کے مطابق کی جاتی ہے تم روزی کی خاطر آئی بیٹھی ہو یہی کافی ہے۔۔۔ یہاں رہو اچھا کھاؤ، اچھا پہنو، اچھا معیار زندگی اپناؤ، بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلاؤ باقی سب بھول جاؤ۔''(۴)

مصنفہ کے مطابق جدید سائنس و ٹیکنالوجی نے نہ صرف ہمارے ماحول کو بدلہ ہے بلکہ طرزِ فکر میں بھی زبردست تبدیلیاں کی ہیں۔ لوگوں کا ماضی میں جو رہن سہن تھا اب نہیں رہا کیونکہ جب ٹیکنالوجی عام دسترس میں ہو اور لوگ اسے اختیار کرنے کو بھی تیار ہوں تو اس طرح طرزِ زندگی میں تبدیلی ناممکن نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی بدولت پاکستان کے لوگوں کا بھی معیارِ زندگی بھی کافی بہتر ہو گیا

ہے۔ یہاں بھی اب انسانوں کے کام کاج کے لئے کوئی نہ کوئی خاص مشین موجود ہے جو کافی مدگار ثابت ہوتی ہے۔

لیکن جس قدر تیزی سے آج دنیا نئے نئے علوم وفنون کے جزیرے تلاش کر رہی ہے اس میں ہر لمحہ ایک نیا انکشاف ظاہر ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بانو قدسیہ کے نزدیک آج ترقی یافتہ ممالک یا اقوام جس تیزی کے ساتھ ترقی کی منازل طے کر رہے ہیں اس سارے عمل نے ترقی پذیر اقوام کے لئے ایک بڑے چیلنج کے مدمقابل لا کھڑا کیا ہے۔ گویا یہ چیلنج ایسی صورت حال میں شدید تر ہو جائے گا، اگر ان ترقی پذیر اقوام کی ترقی و ارتقاء کو جدید علوم وفنون سے وابستہ نہ کیا گیا۔ اس طرح ہم جیسی ترقی پذیر ممالک نہ صرف پیچھے رہ جائیں گے بلکہ زوال و تعطل کا شکار بھی ہو سکتے ہیں۔ ایک طرف دنیا آج گلوبل ولیج کی شکل اختیار کر چکی ہے جبکہ ہم پاکستانی قوم مسلمان ہونے کے ناطے ابھی تک ترقی پذیر ممالک کی صف میں کھڑے ہیں۔ ہم ابھی تک ذاتی اور سیاسی لڑائیوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ ہر جگہ نفسا نفسی اور مرنے مارنے کی باتیں ہیں۔

> ”لاہور میں نظریاتی اختلافات کے ہاتھوں دوستوں میں بول چال بند ہو جایا کرتی تھی۔ لیگ اور پیپلز پارٹی نے خاندانوں کو دو پارٹیوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ڈرائنگ روم کی فضائیں ور بل ڈایئریا کے ہاتھوں بدبودار تھیں۔ قیمتیں فلک بوس ہو رہی تھیں۔ ڈالر کی قیمت بڑھ جانے کے باعث کئی گھروں میں مالی استحکام ناممکن تھا اور لوگ ان مشکلوں کے ہاتھوں حیرت زدہ مرنے مارنے کی سوچ رہے تھے۔“(۵)

لیکن اسی ترقی نے مغرب کو باقی خطوں سے ممتاز بھی کر دیا ہے۔ آج کی ترقی مغرب کی مرہون منت ہے۔ یہ مغرب ہی ہے جس نے سائنس و ٹیکنالوجی سے باقی دنیا کو روشناس کرایا۔ ہندوستان آزادی سے قبل انگریزوں کی وجہ سے ہی ترقی کی راہ پر گامزن ہوا، وگرنہ ہم آج بھی پرنٹنگ پریس، جدید ذرائع مواصلات اور جدید ٹیکنالوجی کے بغیر زندگی بسر کر رہے ہوتے۔ سائنس کی جس بھی فیلڈ کی بات کی جائے آج یورپ ہمارے سے اس فیلڈ میں کم سے کم بھی چالیس پچاس سال آگے ہے۔

تعمیرات کے حوالے سے بات کی جائے تو مغرب کثیر المنزلہ عمارتیں بنانے میں مصروف ہے، ہر عمارت تعمیرات کا شاہکار ہے، پل، سڑکیں اور ڈیم وغیرہ جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے دنوں میں بن جاتے ہیں اور پائیداری کی اپنی مثال آپ ہیں۔ ہم نے یہ علم انگریزوں سے سیکھا اور اس سے متعلقہ ساری مشینری انگریزوں

کی دین ہے۔ لیکن ٹیکنالوجی کے باوجود مشرق میں ہنوز کثیر المنزلہ کی نسبت ایک یا دو منزلہ تعمیرات کا رواج ہے۔ اس کے بالمقابل مغرب میں فلیٹ سسٹم موجود ہے، پختہ اور صاف سڑکیں نظر آتی ہیں اور سوپر مارکیٹس ہر جگہ موجود ہیں۔

''ہمارا نو ساختہ گھر پہلی منزل پر ہے۔ گیراج سے نکلتے ہی لش لش چمکتی پکی سڑک ہے۔ یہ سڑک سرکاری نہیں۔ اس ایریا کی ہاؤسنگ نے اسے تعمیر کیا ہے۔ لیکن اپنی پختگی، صفائی ستھرائی میں یہ کسی بھی ہائی وے کو مات کرتی ہے۔ امریکہ کا عمومی معجزہ جینز سڑکیں اور سوپر مارکیٹ ہیں۔ یہاں یورپ جیسے میوزیم، گرجا گھر اور ثقافتی عجائب گھر اپنی جغرافیائی شکل میں نہیں ہیں۔''(۶)

اسی طرح طب کے حوالے سے بھی مغرب اپنی مثال آپ ہے۔ ویکسین کی تیاری ہو یا وباؤں پر کنٹرول، موذی بیماری کا علاج دریافت کرنا ہو یا بیماری کی جدید تشخیص، سب مغرب سے مستعار ہے۔ ہمارے جیسے ترقی پذیر ممالک کی عوام علاج کے لئے ہمیشہ مغرب کا رخ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناول میں اقبال بھی اپنی بیٹی کے علاج کے لئے امریکہ ہی وارد ہوتی ہے۔

''میں آپ کو بتاؤں۔۔۔ یہاں آنے سے پہلے مونا کی ذہنی حالت کو دیکھ کر میں تلملایا کرتی تھی۔ میں نے مونا کے بڑے علاج کئے۔ ایلوپیتھک، بائیوکیمیک، حکیمی علاج، ہومیو پیتھک۔۔۔ میں ۔۔۔ مونا کو اپنی Retarted بچی کو لے کر کہاں کہاں نہ گئی۔۔۔ اور میرا یہاں ٹھہرنا مونا کی صحت کے لئے ضروری ہے، بہت ضروری۔ وہ کچھ کچھ نارمل ہو رہی ہے ہمایوں جی۔''(۷)

مغرب موبائل اور کمپیوٹر کے انقلاب سے لطف اندوز ہو رہا ہے جبکہ ہمارے پاس استعمال یا پرانے موبائل اور کمپیوٹر آتے ہیں۔ مغرب کی کاریں انتہائی جدید اور ایڈوانس ہیں جبکہ ہماری صرف اشرافیہ اس قسم کی آسائشیں استعمال کرنے کی متحمل ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرقی انسان بھاگ بھاگ مغرب کا رخ کرتے ہیں تاکہ ان آسائشوں سے لطف اندوز ہو سکیں۔

بانو قدسیہ کے مطابق مشرق سے ہنوز اپنے ملکوں کے مسائل نہیں سنبھالے جا رہے جبکہ مغرب فلکیات پر اپنی کمندیں ڈال چکا ہے۔ ستاروں سے آگے مزید ستارے تلاش کئے جا رہے ہیں، چاند اور سورج تک

کو پر کھا جا رہا ہے۔ انسان زمین کی گہرائی سے واقف ہو چکا ہے اور آسمان کی بلندی سے واقفیت حاصل کرنے کی تگ ودو میں مصروف ہے۔ یہ سب مغرب کے کارنامے اور جدیدیت وعالمگیریت کے شاخسانے ہیں۔ مغرب جدید سے جدید جہاز، آبدوزیں، گاڑیاں، کاریں، ریل کاریں بنا کر سفر کے مزے لے رہا ہے جبکہ ہم آج بھی اپنے شرعی مسئلوں میں الجھے بیٹھے ہیں۔ کیا ٹی وی دیکھنا حلال ہے؟ نیز کتنی داڑھی رکھنا سنت ہے؟ اس سب کے بیچ ہماری کل ٹیکنالوجی ایک مکھی کے پر کے برابر بھی نہیں ہے۔ ہم آج بھی سائیکل اور موٹر سائیکل پر سفر کرتے ہیں اور ریل گاڑی کا وہی فرسودہ نظام استعمال کر رہے ہیں جو انگریز کئی سال پہلے چھوڑ چکا ہے۔ ہم ان چیزوں کے سپیئر پارٹس بھی بنانے کے اہل نہیں ہیں۔ آ جا کر ہم بس ایک ایٹم بم ہی بنا پائیں ہیں لیکن اس کے باوجود ہمارا احساس کمتری ختم ہونے کی بجائے مزید بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔

> ''تھرڈ ورلڈ کے لوگ عام طور پر اور مسلمان ممالک خصوصی طور پر اپنی نالائقی پر بہت پشیمان ہیں، وہ ایٹم بم بنا کر بھی احساسِ کمتری سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے۔ جب ترقی کا حالیہ نسخہ ان کے ہاتھوں میں آتا ہے تو احساسِ جرم سے وہ سٹ پٹا کر مسجد کی طرف بھاگتے ہیں۔ جب نئی ترقی کا جن ان کے دروازہ پر دستک دیتا ہے تو وہ اسے وارنٹ سے کم نہیں سمجھتے۔''(۸)

مغرب کی ترقی ہر میدان میں واضح ہے۔ برقیات کا ہی شعبہ اگر دیکھیں تو اس میں جتنی ترقی ہوئی ہے وہ مغرب کی جدید سائنس کی بدولت ہے۔ انگریز کی آمد برصغیر میں برقی قمقمہ لائی وگرنہ ہم مٹی کا دیا جلانے کے عادی تھے۔ آج دنیا ربورٹس کی مدد سے اپنے کام سرانجام دے رہی ہے۔ انسانوں پر انحصار کم کیا جا رہا ہے۔ صنعتی ترقی کا دور دورہ ہے۔ بانو قدسیہ کے نزدیک انگریز کی ترقی کا راستہ مشرق کی سستی مزدوری سے ہو کر گزر رہا ہے۔ ایسے میں مشرق کا استحصال ہو رہا ہے۔ انسان کو انسان نہیں سمجھا جا رہا۔ انسان کو بھی مشین بنایا جا رہا ہے۔ مشینی تمدنی دور میں اہل مغرب نے انسان سے انسان کی صفات تک چھین لی ہیں، مزدور پہلے سے زیادہ کمزور ہو رہا ہے اور مالک زیادہ طاقتور بنتا چلا جا رہا ہے۔

> ''اس خاص تمدن کے اثرات سب سے زیادہ محنت کش طبقے پر مرتب ہو رہے ہیں۔ فیکٹریوں میں ہونے والا کام انسان کی شخصیت کو تقریباً ناکارہ بنا دیتا ہے۔۔۔ جہاں ٹیکنالوجی غالب آ چکی ہے اور انتظامیہ کا استبداد ہے وہاں کے صنعتی کارکن ایک انقلابی قوت ہونے کی صلاحیت سے محروم ہو چکے ہیں۔ استحصال زدہ طبقوں کی مثال میں سب سے پہلے صنعتی معاشرہ آتا ہے

جس کے افراد کو بار بار دھوکہ دیا جاتا ہے۔"(۹)

اپنی اس ترقی میں مشرق ایک آلے کا کردار ادا کر رہا ہے۔ مغرب اسے اپنی ترقی کے لئے ایک سیڑھی کے طور پر استعمال کر رہا ہے لیکن اس ترقی میں مشرق پھر بھی حصہ دار نہیں ہے۔ مشرق آج بھی پسماندگی، غربت، جنگ و جدل میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ مغرب جدید ٹیکنالوجی سے جتنا پانی پینے کے لئے حاصل کرتا ہے اس سے زیادہ مشرق میں خون بہادیا جاتا ہے۔ پھر مساوی حقوق، مساوی نمائندگی کے نعرے لگائے جاتے ہیں، جبکہ خود کے پاس ویٹو پاور کا اختیار سنبھال کر رکھا ہوتا ہے۔ اپنا اسلحہ بیچنے کے لئے دوسروں کو اسلحہ بنانے سے روکا جاتا ہے۔ اپنے موبائل اور انٹرنیٹ کو بیچنے کے لئے ترقی پذیر قوموں کو سوشل میڈیا کی ڈگر پر ڈال دیا جاتا ہے تاکہ ایک تو ان کی ٹیکنالوجی بک جائے اور دوسرا ترقی پذیر قومیں اس سب کے بیچ ترقی کے بارے میں خاطر خواہ سوچ نہ سکیں۔ گویا ٹیکنالوجی کو بھی ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے:

"(امریکہ نے) محکوم قوموں کو ترقی کے نام پر Information Technology کا نعرہ دیا۔ یہ مغرب کے کمپیوٹر سیٹ بیچنے کا ذریعہ ہے کیونکہ ترقی پذیر ممالک میں کمپیوٹر سے متعلقہ صنعتیں لگانے کی اجازت نہیں Highly Sophisticated ٹیکنالوجی پر پابندی ہے۔ Global power اسلحہ اور ٹیکنالوجی میں کسی اور ملک کو اور بالخصوص کسی مسلمان ملک کو ترقی کرنے اور خود کفیل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی کیونکہ اس کے غلبے کو چیلنج کرنے والا کوئی نہیں پیدا ہونا چاہیے۔"(۱۰)

مصنفہ کے نزدیک یہ سب تضادات اور امتیازات ہیں جو مشرق و مغرب کا منہ چڑا رہے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کا کوئی ایک بھی شعبہ ایسا نہیں جس میں مشرق مغرب کا مقابلہ کر سکتا ہو۔ نہ ہی کوئی شعبہ ایسا ہے جو مشرق سے ایجاد ہو کر مغرب گیا ہو، سب مغرب کی جدید سوچ اور ٹیکنالوجی کا نتیجہ ہے۔ آج اگر مغرب اپنے مصنوعی سیارے سے ہمیں بے دخل کر دیں تو ہم ٹی وی، وائی فائی، انٹرنیٹ کی جھلک کو ترس جائیں اور اگر طبی حوالے سے ہماری مدد کرنا بند کر دے تو شاید ہم نزلے، زکام کو ہی نہ سہہ پائیں، غرض تمدنی اعتبار سے ترقی اور جدید ٹیکنالوجی کا ہر میدان خواہ وہ ارضیات ہو یا انجینئرنگ، بحرپیمائی ہو یا تعمیرات، جوہریات، حیاتیات، حیوانیات، فلکیات ریڈیو ٹیکنالوجی ہو یا موسمیات، شماریات، میکانیات، معدنیات، طبیعات سب مغرب کی مرہون منت ہے۔

ب۔ فلسفیانہ وصوفیانہ امتیازات

i. فلسفہ اور صوفی ازم کا تعارف:

انسانی تہذیب کا ارتقا تعلیم کا ہی نتیجہ ہے۔ تاہم تعلیم سے متعلق ہر سوال کا جواب آخر کار ہمارے فلسفہ زندگی سے ہی متاثر ہوتا ہے۔ انسان کے ذہن میں ہمیشہ تین قسم کے سوالات ابھرتے رہتے ہیں یعنی کوئی شے کیا ہے؟ کیسے ہے؟ اور کیوں ہے؟ کیا اور کیسے کے جواب سائنسی فکر سے حاصل کئے جاسکتے ہیں جبکہ کیوں کا جواب فلسفہ مہیا کرتا ہے۔ جس سے خیالات، تصورات، اصول اور کلئے وضع کئے جاتے ہیں اور ان کی قدرو منزلت اور اہمیت بیان کی جاتی ہے۔

لفظ فلسفہ یا فلاسفی (PHILOSOPHY) یونانی زبان کے دو الفاظ "Phila" بمعنی "محبت" اور "Sopia" بمعنی "حکمت و دانائی" سے مل کر بنا ہے۔ یعنی حکمت و دانائی سے محبت کرنا۔ ادبی اصطلاحات میں پروفیسر انور جمال ارسطو اور افلاطون وغیرہ کے حوالے سے فلسفے کی تعریف کچھ یوں کرتے ہیں۔

> " فلسفہ اشتیاق علم اور تلاش دانش کا نام ہے۔ فلسفے کو روح علوم کہنا بے جانہ ہو گا۔ افلاطون نے فلسفے کی تعریف یہ کی ہے ۔'اشیاء کی فطری ہیئت کے لازمی اور ابدی علم کا نام فلسفہ ہے۔' جبکہ ارسطو نے کہا ہے ۔'فلسفہ وہ علم ہے جس کا کام یہ دریافت کرنا ہے کہ وجود کی اصل ماہیئت یا وجود بالذات اپنی فطرت میں کیا ہے۔ نیز یہ کی وجود کے اغراض و خواص اس کی اپنی فطری قدر کے لحاظ سے کیا ہیں۔' کانت نے سب سے زیادہ سادہ تعریف کی ہے۔ 'یہ انتقاد کا علم ہے'۔ الغرض فلسفہ، غور و فکر کے بعد کسی نتیجے پر پہنچنے کا عمل ہے۔"[۱۱]

اصطلاحی معنوں میں دیکھا جائے تو حیات و کائنات کے اہم مسائل پر غور و فکر کرنے اور ان کو سمجھنے کی شعوری کوشش کا نام فلسفہ ہے۔ کیونکہ فلسفہ سراسر عقلی و ذہنی عمل ہے۔ یوں فلسفی مسائل و افکار کا تنقیدی جائزہ لیتا ہے۔ ان کی توجیہ پیش کرتا ہے اور اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ لہذا اشیاء کے حقائق کے ساتھ ساتھ عقائد و نظریات پر بحث کرنا اور ان کی اصل حقیقت معلوم کرنا اس کے دائرہ عمل میں داخل ہے۔ فلسفہ صرف دلیل اور عقل کا محتاج ہے۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات کے مطابق:

> "وجود، فطرت، سماج، انسان، علم، حقیقت، اور ان کے باہمی رابطوں کے عمومی قوانین اور

اصول و (مبائی) کا مدلل علم فلسفہ کہلاتا ہے۔"(۱۲)

فلسفہ دراصل حقیقت کی تلاش اور حب دانش کا نام ہے۔ اسی لئے فلسفیانہ مسائل کو حل کرنے والے کو حکیم، دانا یا فلسفی کہا جاتا ہے۔ تاریخ فلسفہ یونان کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ فیثا غورث نے سب سے پہلے فلسفہ کا لفظ استعمال کیا تھا۔ فلسفہ ہمیں فکر کی بلندیوں تک پہنچاتا ہے۔ جس پر جا کر فلسفی صداقت اور حقیقت جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا رجحان ہے جس میں فلسفہ بہ حیثیت مجموعی فکرِ انسانی اور ممکنہ حقیقت کی ایک تصویر پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بقول حفیظ صدیقی "فلسفہ نام ہے مدلل علم اور دانشِ دوستی کا"(۱۳)

تمام تر علوم کی ابتداء فلسفہ سے ہوتی ہے جو شخص طبعیات، کیمیا، طب، ہندسہ، موسیقی، نفسیات، معاشیات، فلکیات، مابعد الطبعیات غرضیکہ تمام علوم پر دسترس رکھتا ہے اسے دانا، حکیم، یا فلسفی کہا جاتا ہے۔ وہ عقلی اور فکری لحاظ سے دوسروں سے برتر ہوتا ہے۔ فلسفے ہی سے تمام علوم نکلے ہیں۔ کانت نے اسی لئے فلسفے کو ام العلوم کہا تھا۔ یعنی فلسفہ تمام علوم کی ماں ہے۔

جبکہ تصوف روحانی نسبت کا ایسا طریقہ ہے جو ایک خاص کیفیت، ایک خاص تخلیقی طرز احساس کے نام سے عبارت ہے۔ یہ کوئی مذہب یا طریقہ نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی خدا پرستی کا نام ہے۔ کیونکہ یہ فلسفے سے بالاتر ہے اس لئے اس کا تعلق ذہن سے نہیں بلکہ قلب و احساس سے سروکار رکھتا ہے۔ لہذا تصوف کو قرآنی اصطلاح میں تزکیہ نفس اور حدیث کی اصطلاح میں احسان کہتے ہیں۔

> "تصوف صرف روحانی، باطنی کیفیات اور روحانی اقدار و اطوار کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ علمی، فکری، معاشرتی اور تہذیبی و عمرانی تمام جہتوں میں اخلاص و احسان کا نام تصوف ہے۔"(۱۴)

عطش درانی نے اپنی کتاب اسلامی فکر و ثقافت میں تصوف کی کے حوالے سے لکھا ہے:

> " ہم کہہ سکتے کہ عملی طور پر تصوف ایسا طریقہ حیات ہے جس کا مقصود ذاتِ خداوندی سے بلاواسطہ رابطہ پیدا کرنا ہے۔ اس رابطے کے حصول کے لئے ہر شخص کو چند روحانی تجربات میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جنہیں وارداتِ قلب کہتے ہیں۔"(۱۵)

تصوف کو عملی طور پر اختیار کرنے والے اور اس کی راہ پر چلنے والے کو صوفی کا نام دیا گیا ہے۔ لغوی اعتبار سے صوفی کا لفظ "صفا" سے مشتق ہے جس کے معنی قلب کی صفائی کے ہیں۔ لہذا صوفی کو صوفی اسی لئے

بھی کہا جاتا ہے کہ اس کا قلب مختلف ذہنی و باطنی بیماریوں سے پاک اور صاف ہو تا ہے۔ گویا "صفا" کی اصل غیر اللہ سے دل کو منقطع کرنا اور دنیا و فانی سے دل کو خالی کرنا ہے۔ ابولا عجاز صدیقی اپنی کتاب " ادبی اصطلاحات کا تعارف" میں صوفی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "عام طور پر کلمہ صوفی کو صوف ہی سے مشتق سمجھا جاتا ہے۔ اصطلاح صوفی وہ شخص ہے جو تصوف کی فکری اور روحانی اقدار کے مطابق زندگی بسر کرے۔"(۱۶)

اللہ کے نیک بندے یعنی صوفی لوگ دنیا کی بے ثباتی سے رُخ موڑ کر خدا کی ذات میں پناہ حاصل کرتے ہیں اور اپنی طبعیت سے آزاد ہو کر اللہ کی ذات کی دائمی اور مستقل حیثیت پر زور دیتے ہیں۔ وہ ہر زبان پر محبوبِ حقیقی کا ذکر اور ہر طرف اس کے جلوؤں کی نمائش اور ظہور پر زور دیتے ہیں۔ قناعت، توکل، تسلیم و رضا، صبر و تحمل اور استقلال کے جوہر ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوتے ہیں۔

ii. حاصل گھاٹ میں فلسفیانہ اور صوفیانہ امتیازات

بانو قدسیہ اکیلی کسی انفرادی شخصیت کا نام نہیں، یہ تو ادب کا پورا ایک دبستان ہے۔ جس کے قبیل میں اشفاق احمد اور قدرت اللہ شہاب بھی شامل ہیں۔ یہ دبستان فلسفہ، تصوف اور ماورائیت کا حامل ہے۔ تینوں ادب کے درخشندہ ستارے ہیں جو ایک دوسرے کی روشنی سے خود کو منور کر کے، روشنی کو آگے سے آگے پھیلانے کا وسیلہ بنتے رہے۔ چراغ سے چراغ جلتے رہے اور روشنی کا یہ سفر آج بھی جاری و ساری ہے۔

فلسفہ اور صوفی ازم دیکھنے میں دو منفرد شعبہ ہائے زندگی سے متعلقہ اصطلاحات ہیں لیکن بانو قدسیہ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے نہایت خوبصورتی سے ان دونوں کو یکجا کر کے ایک منفرد موضوع بنادیا ہے۔ بانو قدسیہ کا فلسفہ مذہب اور اقدار سے متعلقہ ہے جس تک پہنچنے کے لئے تصوف کی سیڑھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ گویا انسان کو دنیا میں فلاح کا طلب گار ہونا چاہیے، یہی انسان کا اول و آخر ملجا و ماویٰ ٹھہر تا ہے۔ سننے میں یہ بات جتنی سہل معلوم ہوتی ہے سمجھنے میں اتنی ہی پیچیدہ ہے۔ انسان کو اس منزل تک پہنچنے کے لئے ایک ساتھی، استاد، گرو، نبی، مرشد، صوفی یا بابے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب انسان کو ان میں سے کوئی وجود مل جاتا ہے تو اس کا آگے کا سارا رستہ نہایت آسان ہو جاتا ہے۔ یہی بانو قدسیہ کا فلسفہ ہے اور یہی ان کا تصوف۔ ان کا بنیادی مقصد بات سمجھانا ہوتا ہے، انسان کو غور و فکر پر ابھارنا ہوتا ہے، وہ حق کے متلاشی کے لئے روٹی کے چھوٹے چھوٹے پھیکنتی چلی جاتی ہیں۔ اب یہ متلاشی پر ہے کہ وہ ان کو کیسے ڈھونڈتا ہے، کس حد تک غور و فکر کرتا

ہے۔ کیونکہ اول وآخر کوشش انسان نے کرنی ہے لیکن اس راہ میں اتنا علم فائدہ نہیں دیتا جتنا معلم فائدہ دیتا ہے، اس راہ میں دکھ سکھ، تکلیفیں اور آسائشیں دیکھنی اٹل ہیں۔ انسان استاد کے بغیر اس کورس میں آگے نہیں بڑھ سکتا۔

> ''لیکن کیا کسی کے دکھ سُکھ میں شریک ہوئے بغیر کوئی اصلی تبدیلی آسکتی ہے؟ کیا مسلک، مذہب، خیال، تحریک صرف علم کے سہارے ممکن ہے؟ کیا نبی کے بغیر، اس کی شفقت کی روشنی نہ ہوتے ہوئے صرف کتاب سے مذہب کی تبدیلی ممکن ہے؟ کیا استاد، گرو، مرشد کے بغیر انسان علم کو عمل میں ڈھالنے کی تبدیلی لاسکتا ہے۔۔۔؟''(۱۷)

حاصل گھاٹ میں اس حوالے سے مشرق ومغرب کا واضح فرق دیکھایا گیا ہے۔ مشرق ہمیشہ سے فلاح کا طالب رہا ہے۔ یہاں نبیوں، ولیوں، قلندروں، بابوں کا ڈیرا ہے۔ انسان بڑوں، بزرگوں کی بات سنتا اور سمجھتا ہے۔ عرب نے اسی سبب نبیوں کو قبول کیا۔ یہاں غیب کا علم چلتا ہے اور اس پر ایمان لایا جاتا ہے۔ دنیاوی علم اس راہ میں راہبر کے بغیر بے کار ہے۔ جبکہ مغرب کا حساب اس سے سراسر مختلف ہے۔ مغرب علم ومعرفت کا دلدادہ اور پروردا ہے، یہاں سائنس، مشاہدات، پریکٹیکل، اعداد وشمار اور ہندسوں کا زور چلتا ہے۔ ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ اسی سبب وہاں کے پیمانے مختلف ہیں۔ مشرق کی باتیں مغرب میں دقیانوسی اور جاہلیت کی باتیں سمجھی جاتی ہیں۔

مغرب ہمیشہ سے دلیل کا طلب گار ہے۔ باریک باتیں انہیں سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے، جبکہ تصوف سراسر باریک باتوں اور ذوقی مشاہدات کا حامل ہے۔ ایسے میں مغرب میں کبھی بھی یہ علم نہ پنپ سکا اور نہ کبھی ترقی کر پایا۔ ان کے نزدیک فلاح کا مطلب اتنے پیسے کما لینا ہے کہ ان کا مستقبل محفوظ ہو جائے۔ اسی بھاگ دوڑ میں ان کی ساری زندگی گزر جاتی ہے۔ یہی چیز بانو قدسیہ نے محسوس کی اور اس کو زائل کرنے کے لئے انہیں نے ناول میں مشرقی تصوف کو جگہ دی۔ بانو قدسیہ نے لبرلز کو نبی کی ضرورت سمجھانے کی کوشش کی۔ لبرلز عقل کے گورکھ دھندے میں پڑ کر اور علم کے سمندر میں غوطے لگا کر آگے بڑھنا چاہتے ہیں، ان کے نزدیک کامیابی کا ضامن یہی عقل اور علم ہے۔ لیکن وہ اس بات سے نابلد ہوتے ہیں کہ ایسے ہر کسی کی عقل کا پیمانہ اور معیار الگ ہے۔ وہ کس کی عقل کو معیار ٹھہرانا پسند کریں گے؟ یہی وجہ ہے کہ مصنفہ کے نزدیک نبی، اُمی ہوتے ہوئے بھی، راہنما ہوتا ہے۔ وہ خدا سے، جو تمام طاقتوں کا مالک ہے، پکے رابطے میں ہوتے ہیں۔

> ” یہی تو سوچنے والی بات ہے جانِ من۔ انسان پیمانہ نہیں، نبی پیمانہ ہے۔۔۔اسی پر عمل تولا جاسکتا ہے، اسی لبرل ازم کو جانچا جاسکتا ہے۔ وہی سوچ کی درستگی کا ضامن ہے۔ بغیر بنی کے تو انسان کو پرکھنے، جانچنے، ناپنے کے لئے اپنی اپنی عقل درکار ہوگی اور تم جانتے ہو ہر انسان کی عقل پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ ہر معمولی انسان کی عقل یونیورسل پیمانہ نہیں بن سکتی اور تم یہ بھی سمجھ لو، اسی لئے نبی کا اُمی ہونا بھی ضروری ہے۔ اس کے پاس انسانی علم نہ ہو کوئی ڈگری، کوئی تعلیم نہ ہو، وہ کسی علم کی طرف پہلے سے راغب نہ ہو، اس کی ہوٹ لائین رب سے ڈائریکٹ ہو اور وہ اسی علم کے مطابق تعلیم دے اور اسی قدر اور وہی تعلیم دے جس کا امر ہو۔“(۱۸)

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا کے پیچھے اندھا دھند بھاگنے سے منع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ دنیا کمانے سے کہیں روکتا نہیں، ہاں وہ اعتدال کا راستہ سکھاتا ہے، فنا کو یاد رکھنے کا سبق دیتا ہے، اس دنیا سے زیادہ آخرت کی طرف توجہ دینے کا حکم دیتا ہے۔ دنیا ایک دلدل ہے، جتنا کوئی اندر جاتا ہے اتنا ہی وہ دھنستا ہے۔

مصنفہ نے انسان کو یہی چیز سمجھانے کے لئے خوشی و غم کے فلسفہ کا سہارا لیا ہے۔ مصنفہ کے نزدیک اس زندگی میں خوشی نام کی چیز عنقا ہے۔ درحقیقت خوشی نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ بدھا کے قول کے مطابق دنیا کا سارا نظام دکھ اور غم پر قائم ہے۔ مغرب کی سب سے زیادہ کوشش خوشی کے حصول کے لئے ہوتی ہے، لیکن وہ جتنا خوشی اور سکون کو پانے کی جدوجہد کرتے ہیں اتنی ہی خوشی ان سے دور بھاگتی ہے۔ بظاہر وہ اپنی طرف سے کوشش کرکے چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو اکھٹا کرتے ہیں لیکن اس خوشی کی قیمت اس سے کئی گنا زیادہ غم اور پریشانیاں ہوتی ہیں۔ گویا خوشی کو پاکر بھی وہ خوشی سے کوسوں دور ہوتے ہیں کیونکہ حقیقی خوشی کے تصور سے بھی وہ ناآشنا ہیں۔ دنیاوی مال و دولت ان کے نزدیک خوشی کا متبادل ہیں۔ لیکن ڈھیروں ڈھیر مال کما کر بھی وہ سکون اور خوشی نہیں نکال پاتے۔ اس کے بالمقابل مشرق کا باسی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار کر بھی خوش ہوتا ہے۔ دو وقت کی روکھی سوکھی کھا کر بھی وہ طمانیت قلبی رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ حقیقی خوشی سے آشنا ہے۔ حقیقی خوشی آخرت کا سامان تیار کرنے میں ہے۔ توشۂ آخرت جتنا اچھا ہوگا اتنا ہی انسان اس دنیا میں حقیقی خوشی کا حامل ہوگا۔ ورنہ اس کی ساری خوشیاں محض وقت کا ضیاع ہوں گی۔

> ”سوچتا رہتا ہوں کی اس دارالمحن سے نکل کر ہمیں کہاں جانا ہے اور غم کی کونسی نئی شکل سے بنرد آزما ہونا ہے؟ کیا خوشی کے لئے سرگرداں رہنا ہی بنی نوع انسان کی اصل جدوجہد

ہے؟‘‘(۱۹)

بانو قدسیہ نے دنیاوی خوشیوں کو غم اور دنیاوی غموں کو خوشی کے فلسفے کے طور پر پیش کیا ہے۔ جو انسان آخرت کی تیاری کے لئے اس دنیا میں غم اٹھائے گا وہ فلاح پائے گا اور جو اس دنیا کو سب کچھ سمجھ کر اس کے پیچھے بھاگے گا، اس کی خوشیاں بظاہر موجبِ خوشی لیکن حقیقتاً باعث غم ہوں گی۔ اس دنیا میں خوشی، غم کے درمیان محض ایک عارضی وقفہ ہے۔ انسان غم سے غم تک کے سفر میں خوشی کے سائبان میں محض چند ساعتیں آرام کر کے خوش ہوتا ہے اور پھر دوبارہ سے دنیا کی دھول میں گم ہو کر غم اور تکلیف ہی اٹھاتا ہے۔

> ’’بیچارہ دنیا میں قدم دھرتا ہے تو روتا ہے، جب وہ رخصت چاہتا ہے تو لوگ روتے ہیں۔ ان دو وقفوں کے درمیاں اسی رونے سے گریزاں وہ عرصہ حیات کو لغو اور بے معنی خوشی کی تلاش میں گزار دیتا ہے۔ کیا غم سے لڑنے بھڑنے، نبرد آزمائی کرنے یا غم سے خوشی اور خوشی سے غم کی جانب شٹل کاک کی طرح مارے جانے کا نام زندگی ہے؟۔۔۔ انسان غم کی گرفت سے کبھی نہیں نکلتا۔ خوشی محض تکان اتارنے کا وقفہ ہے اور ماندگی کے اس وقفے سے تازہ دم ہو کر انسان پھر غم کی تلاش میں بگولا بن کر کہیں گرتا کہیں گھومتا کہیں سرپٹ بھاگتا زندگی گزارتا رہتا ہے۔‘‘(۲۰)

یہی خوبی انسان کو دوسرے انسانوں سے ممتاز کرتی ہے۔ بظاہر ایک انسان دوسروں سے زیادہ کام کر کے بھی پیچھے رہ جاتا ہے، اس کی بنیادی وجہ اُوپر والی رسی سے تعلق کمزور ہونا ہوتا ہے۔ جو انسان دنیا کی بجائے آخرت کے پیچھے بھاگے گا، خدا اس کو دنیا میں کامیاب کرتا ہے اور آخرت میں بھی سرخرو کرے گا۔

بعض حلقوں کے نزدیک یہ چیز انسان کو دنیا سے فرار کی جانب دھکیل دیتی ہے، انسان اپنی دنیاوی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کر کے سستی کی جانب راغب ہونے لگتا ہے۔ ناقدین کے نزدیک یہ راہ فلاح نہیں بلکہ راہ فرار ہے۔ اپنی ذمہ داریوں سے کنی کترانے اور تصوف کے صوف میں پناہ ڈھونڈنے کا دوسرا نام ہے۔ لیکن مصنفہ نے ایسے فلسفے کی نفی کی ہے۔ مصنفہ کے نزدیک عمل تو کسی بھی کام کی اساس ہے، اس سے پہلو تہی نہیں برتی جا سکتی۔ ہاں عمل کے بعد نتائج میں بہتری کے لئے انسان اگر اپنی ہمت کی بجائے خدا کی ذات پر بھروسا کرتا ہے تو اس کی کامیابی عام دنیاوی انسان کی کامیابی سے زیادہ ہو گی۔ عام انسان شاید اس منطق کو سمجھ بھی نہ سکے لیکن یہ خدا کا اپنے بندے سے پیار کا سلوک ہے۔

> ''میں آج تک یہ راز نہ جان سکا کہ بعض کو بعض پر سبقت کیوں حاصل ہو جاتی ہے؟ کسی ایک وصف سے بیڑا پار کیسے ہو جاتا ہے؟ چاچا محمد صمد میں کونسی خوبی تھی جس کی بنا پر وہ ہر دلعزیز ٹھہرا اور میرا باپ جس کی ساری زندگی ذمہ داریاں اٹھاتے، وعدے نبھاتے، ناک کی سیدھ چلتے گزری، نہ اپنے لئے خوشی حاصل کر سکا، کسی اور مسرت کے حوالے کر سکا؟ بعض کو بعض پر ترجیح کیا کسی خوبی، محنت، منطقی چناؤ کے باعث ہے کہ یہ اوپر والے کی مرضی کی مرہونِ منت ہے اور جس کی لاجک تک ابھی انسان پہنچ نہیں پایا؟''(۲۱)

پس یہ سب تعلق کا کھیل ہے، جس چیز کا تعلق جس سے جتنا مضبوط ہو گا وہ اس کے اتنا ہی قریب ہو گا۔ لیکن تعلق سے یہاں دنیاوی تعلق نہیں سمجھنا چاہیے۔ مصنفہ کے نزدیک تعلق کی کھونٹی ہمیشہ خدا کے ساتھ باندھنی چاہیے۔ خدا کے تعلق سے مضبوط تعلق انسان کا کسی کے ساتھ نہیں بندھ سکتا۔ مصنفہ نے اس ضمن میں پنجرے اور طوطے کی مثال دی ہے۔ روح ایک طوطے کی طرح جسم کے پنجرے میں قید ہے، دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے لیکن پھر بھی نہ روح جسم کے ساتھ وفا کرتی ہے نہ ہی جسم روح کو نکلنے سے روک پاتا ہے۔ بظاہر اتنی دیر ساتھ رہنے کے باوجود الوداعیہ کے وقت بھی دونوں کو ایک دوسرے سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، ایسے ہی جیسے طوطے کی آزادی یا موت کے باوجود پنجرے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

> ''جہاں تک۔۔۔ میں سمجھ پایا ہوں کہ ہماری روح جسم میں پنجرے کے طوطے کی طرح قید ہے۔ روح مجبوراً طوطا وکرہاً اس پنجرے میں رہتی ہے۔ طوطے کو قطعی پروا نہیں کہ پنجرے پر کیا گزرتی ہے۔ یہ چاہے سونے کا ہو، اسے صرف اسی وقت آزادی میسر آسکتی ہے جب پنجرہ چھوڑ کر طوطا اپنے راستے جا نکلے۔ نہ پنجرے کو اس بات کی پریشانی ہوتی ہے کہ اس کی سلاخوں کے اندر ایک سر پٹکنے تیلتوں سے ٹکرانے والی روح کون ہے، کیا ہے۔ نہ ہی روح پلٹ کر دیکھتی ہے کہ پنجرے پر کیا اور کیوں گزری۔''(۲۲)

تعلق چونکہ حسیات کی ذیل کے فلسفے میں آتا ہے اس لئے اس کو سمجھنا اور سمجھانا تھوڑا مشکل امر ہے۔ مغرب میں انسان خونی رشتوں تک کے تعلق سے بیگانہ ہو جاتا ہے، اس کے نزدیک جو چیز خوشی پہنچا سکے وہی تعلق بنانے لائق ٹھہرتی ہے۔ اب چونکہ مغرب میں انسان کی کوئی خوشی مستقل نہیں ہوتی، اسی سبب مغربی انسان کا کوئی تعلق بھی مستقل نہیں بن پاتا۔ اپنے اپنے مدار میں گھومنے کے سبب ماں، باپ بچے سے پیار کا تعلق قائم نہیں کر پاتے، نتیجتاً اولاد بھی تعلق سے بیگانہ ہو جاتی ہے اور یہ چکر آج بھی جاری ہے۔ کوئی بھی

تعلق انسان سے قربانی، وقت، احساس اور صبر مانگتا ہے۔ جو انسان ان چیزوں سے عاری ہو وہ ہر تعلق سے عاری ہو جاتا ہے۔ مشرق میں قربانی، وقت، احساس اور صبر کے سبب آج بھی ماں کا رشتہ اور تعلق نہایت مضبوط سمجھا جاتا ہے۔ ماں بزرگ بھی ہو جائے تو بھی اولاد کے لئے اس کے احساس اور خلوص میں کوئی کمی نہیں آتی۔ مشرق میں خدا اور نبی کے بعد سب سے مضبوط تعلق کے ضمن میں ماں کا ہی نام لیا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ انسان فطرتاً اپنی ماں کی طرف کھچا چلا آتا ہے۔ انسان ہر پریشانی اور غم خواری میں ماں باپ کو اپنا سہارا سمجھتا ہے۔ اولاد کو پتا ہوتا ہے کہ جس تکلیف سے میں گزر رہا ہوں میرے ماں باپ بھی اسی تکلیف سے گزر رہے ہیں، اگر اولاد کو نیند نہ آئے تو ماں کو بھی نیند نہیں آتی، بچہ بخار میں جلے تو ماں کا سینہ بھی حدت دیتا ہے۔ چونکہ ماں کے تعلق سے خدا کا تعلق سمجھنا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے اس لئے مصنفہ نے تعلق کا فلسفہ ماں کے تعلق سے ہی سمجھایا ہے۔

"تعلق کیا چیز ہے؟

یہ بھی حسیات سے تعلق رکھنے والی غیر مرئی خوبیوں میں سے ایک کیفیت ہے جسے محسوس تو کیا جا سکتا ہے، لیکن سمجھانے پر آئیں تو سمجھا نہیں سکتے۔ ماں کی محبت یا تعلق کو ممتا کہہ کر واضح نہیں کر سکتے۔ ڈکشنری میں یا لٹریچر سے اس کی وضاحتیں ملتی ہیں، ممتا نہیں ملتی۔ جہاد پر جان سے گزر جانے والے بہادر کے جذبے کو اس وقت سمجھا نہیں جا سکتا۔ جب تک آپ خود ایسی بہادری کا حصہ نہ بن جائیں۔ تعلق زندگی سے نبرد آزما ہونے کے لئے صبر کی مانند ایک ڈھال ہے۔ جب کبھی جہاں بھی کوئی سچا تعلق پیدا ہو جاتا ہے، وہاں قناعت، راحت اور وسعت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ کو اندر ہی اندر یہ یقین محکم رہتا ہے کہ آپ کی آگ میں سلگنے والا کوئی دوسرا بھی موجود ہے۔۔۔ دوہرا وزن آدھا رہ جاتا ہے۔"(۲۳)

لیکن تصوف کے ضمن میں خدا کے تعلق کے علاوہ ہر ایک تعلق بے معنی ہو جاتا ہے۔ ایک راہب، صوفی یا جوگی کا دنیاوی تعلقات سے کوئی لینا دینا نہیں ہوتا۔ وہ ہر قسم کے تعلق کو بغرضِ للہ چھوڑ دیتا ہے۔ وہ کسی رشتے یا تعلق کو پاؤں کی زنجیر نہیں بناتا۔ وہ ہر تعلق کو اللہ کے لئے قربان کر لیتا ہے۔ اس کی ہر حاجت اور التجا اللہ کے حضور ہی ہوتی ہے۔ لوگ اسے اللہ والا اور خدا کا بندہ سمجھ کر دوڑے اور کھچے آتے ہیں لیکن وہ سب کو صرف اللہ کی مخلوق سمجھ کر لمحہ بھر کو التفات برتتا ہے پھر دوبارہ سے خدا کی یاد میں محو ہو جاتا ہے۔ یہ

سراسر مشرقی رنگ ہے۔ مغرب میں ایسے تعلق کا سوچنا بھی امر محال ہے۔

صوفی صبر کے اعلیٰ مدارج پر فائز ہوتا ہے۔ بھوک، افلاس، تنگ دستی اس کا کچھ نہیں بگاڑ پاتی۔ وہ فلاح کا متلاشی ہوتا ہے، دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ دنیا کے ہموم و غموم سے اس کا دور دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ وہ دنیا میں رہ کر بھی دنیا کا باسی نہیں ہوتا۔ وہ خدا کا تعلق دار ہوتا ہے۔ ہر قسم کی دوئی کا منکر محض۔ وہ ذات رکھتے ہوئے بھی بدونِ ذات ہوتا ہے، ہر قسم کی قید سے آزاد، ہر اک زنجیر اور تعلق سے ماورا۔ وہ خدا کی ذات میں کامل گم ہو جاتا ہے۔ یہ وہ حالت ہوتی ہے جس کا ذکر صوفیا وجد میں یوں کرتے ہیں:

؎ مَن تو شُدم تو من شُدی، من تن شُدم تو جاں شُدی

تا کس نہ گوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری

یعنی میں تُو بن گیا ہوں اور تُو میں بن گیا ہے، میں تن ہوں اور تو جان ہے۔ پس اس کے بعد کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میں اور ہوں اور تو اور ہے۔ مصنفہ نے اس تمام بحث کا نقشہ اپنے الفاظ میں کچھ یوں کھینچا ہے:

> ”مشرق میں جب کوئی راہب، صوفی، جوگی تعلقات کی دھجیاں جوڑ کر رلی بناتا ہے تو اس گدی پر بٹھانے کے لئے اسے آواز دیتا ہے جو نظر نہیں آتا۔ مکمل فراق کی زنجیر سے بندھ کر ہر تعلق ہر توقع توڑ کر جوگی کی آزادی پابجولاں ہو جاتی ہے۔۔۔ صوفی ہر لمحہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ تعلق کے سمندر میں اپنی کشتی چھوڑ دے لیکن قطرہ بھر بھی کشتی کے اندر نہ آنے پائے۔ اپنے غموں سے بنرد آزما ہونے کے لئے وہ تعلق کی رسی پانیوں میں پھینکنے کے بجائے اوپر کی طرف اچھالتا ہے اور تعجب اس بات پر ہے کنڈی اوپر لگے نہ لگے، وہ فلاح کے ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں تعلق کے جھنڈے کی بھی اسے ضرورت نہیں رہتی۔ وہ ہر قسم کی دوئی سے نبرد آزما ہونے کے لئے تیار رہتا ہے۔ اب اسے غم بھی قید نہیں کر سکتا۔ وہ تعلق اور توقع سے فارغ ہو کر ایک ایسی آزادی سے آشنا ہوتا ہے جو مکمل طور پر اپنی ذات کو ارپن کرنے کا فن ہے۔ نہ آزادی کا شوق باقی رہتا ہے نہ تعلق کا۔“(۲۴)

مصنفہ کے نزدیک صوفیا کے راستے کی سب سے بڑی روک یہی تعلق ہی ہے۔ عام دنیاوی قاعدے ہے کہ نیک پروین سے نیک پروین بیوی بھی اپنے خاوند کے دل میں کسی اور کے لئے جگہ نہیں سہہ پاتی تو خدا کا معاملہ تو اس سے بہت بلند اور ماورا ہے بھلا دوئی والے انسان میں خدا کیسے سما پائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیا اور

خدا والے اپنا گھر بار سب خدا کی راہ میں چھوڑ دیتے ہیں۔ ہمارے پیارے نبی ﷺ نے خدا کی خاطر اپنے پورے خاندان سے ٹکر لے لی، حضرت موسیٰؑ بادشاہت سے بیگانہ ہو گئے، گوتم بدھ جیسا انسان جس کی ساری پرورش ناز و نعم سے ہوئی تھی، اس کے وجود میں بھی جب فلاح جوش مارتا ہے تو وہ ہر تعلق کو توڑ کر، حتیٰ کہ اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر بن باسی ہو جاتا ہے۔

"دراصل عزیزہ تمہارا کوئی قصور نہیں۔۔۔ یہ تعلق چیز ہی ایسی ہے۔ انسان کو بھگل کر دیتا ہے۔۔۔ صوفیا تو کہتے ہیں کہ رستے کا سب سے بڑا حجاب ہی تعلق ہے۔ نہ تعلق سے دل خالی ہوتا ہے نہ اصلی قرار دل میں آتا ہے۔ معمولی سے مہمان کے لئے کمرہ خالی کرنا پڑتا ہے۔ پھر اوپر والے کے لئے تو چھوٹا سا بت بھی اندر رہ جائے تو اس کی سواری نہیں اترتی۔"(۲۵)

لیکن تعلق چھوڑنا اتنا آسان کام نہیں۔ اس میں غم ہیں، حزن ہے، تکلیف ہے، پریشانی ہے۔ اوائل میں انسان خود کو بالکل اکیلا محسوس کرتا ہے۔ غم، فکریں اس کو چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے۔ وہ شگونوں کے چکر میں پڑ جاتا ہے۔ کیا اچھا ہے کیا برا ہے؟، وہ ٹھیک بھی کر رہا ہے یا نہیں؟۔ زندگی اسی گورکھ دھندے میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔ انسان ایک طرح سے لاحاصلی کی تصویر بن جاتا ہے۔

اس سب سے بچنے کا ایک ہی نسخہ ہے، صبر۔ سب کچھ بھول کر "اَلَستُ بِرَبِّکُم" کی صدا کو سننا۔ سب آرزوؤں کو ایک طرف ڈھیر لگا کر جلا دینا۔ دھونی رمانا۔ صرف ایک تعلق کو ڈھونڈنا، اپنی کنڈی بار بار ہوا میں اچھالنا اور صبر، صبر اور صبر کا دامن تھامے رکھنا۔ جب انسان صابرین میں سے ہو جاتا ہے تو پھر اس کی تمام فکریں تمام ہو جاتی ہیں۔ پھر خدا اس کی سنتا ہی سنتا ہے، اس کی پکار کا جواب دیتا ہے خواہ چالیس سال ہی لگ جائیں گے۔ اس کو شرف قبولیت بخشا جاتا ہے۔ مصنفہ کے مطابق ایسے میں شہہ رگ سے قریبی تعلق اس کا ہاتھ تھام کر اوپر کھینچ لیتا ہے۔ اس کی تمام فکریں، پریشانیاں اب اس کی نہیں رہتی، وہ خدا کی ہو جاتی ہیں۔

"عموماً دیکھا گیا ہے کہ صابرین کا کہیں نہ کہیں سچا تعلق پیدا ہو جاتا ہے، پھر اسی تعلق کی برکت سے بات سننے والے، مدد کرنے والے آپ کے غم میں جھلنے والے کی موجودگی میں غم کی کاٹ نہیں رہتی۔ یہ تعلق کسی سائیکالوجسٹ، سائیکی ایٹ رسٹ سے اس لئے بھی بڑا ہوتا ہے کہ یہ ہر وقت شہ رگ کے ساتھ رہتا ہے اور انسان آہستہ آہستہ اپنا سارا بوجھ اس پر ڈالنے کا عزم کرنے کے بعد نسچنت ہو جاتا ہے۔۔۔"(۲۶)

مصنفہ کی فلاسفی کے مطابق یہی فلاح کا حقیقی راستہ ہے۔انسان ایک بار اس صابرین والے گروہ میں داخل ہو جائے تو اس کی دنیا و آخرت دونوں سنور جاتی ہیں،وہ من کی مراد پا جاتا ہے،اپنے مقصد پیدائش کو ڈھونڈ لیتا ہے۔لیکن اس تمام کی تمام راہ میں صبر کا دامن لازم اور مستقل مزاجی شرط ہے۔یہ ایک جہاد ہے،اور اس جہاد کو ہمارے پیارے آقا نے جہاد اکبر قرار دیا ہے۔یعنی دشمن کوئی اور نہیں انسان کا اپنا نفس اس کا سب سے بڑا دشمن ہے۔یہی وجہ ہے کہ جہاد کسی کافر کے خلاف نہیں اپنے اسی نفس سے کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ فلاح کا راستہ ہے، لیکن اس میں خواہشات اور غموں کا کوئی عمل دخل نہیں۔یہ ہر قسم کے غم سے پاک جگہ ہے۔یہاں غموں کو پنپنے کو موقع ہی نہیں مل پاتا،وہ اپنی موت آپ مر جاتے ہیں۔اس راہ میں انسان کو اتنے مجاہدات سے گزرنا پڑتا ہے کہ انسان کے نفس کو تکالیف جھیل جھیل کر خود ہی قرار آ جاتا ہے۔صبر اس راہ میں انسان کا ساتھی ہوتا ہے،وہ ہاتھ پکڑ کر انسان کو فلاح کی راہ پر گامزن کر دیتا ہے۔

> ”فلاح کی راہ پر چلنے والے غم سے نپٹنے کے لئے صبر کی ڈھال استعمال کرتے ہیں۔جہاد بالنفس کے معاملے میں اور کوئی منتر ٹوناکام میں نہیں لاتے۔صبر کا دارو پینے والے شرم وحیا کے ساتھ اپنی تکلیفوں کو راز رکھنے کا طریقہ سیکھ کر غم کے دہکتے کوئلوں کو دم پخت کرنے کا فن سیکھ جاتے ہیں۔یہاں غم کی بوٹی کو گھاس سے چننے کا رواج نہیں بلکہ بغیر آکسیجن دیئے غم کو مار ڈالنے کا ہنر سکھایا جاتا ہے۔“(۲۷)

لیکن یہ طریقہ مغرب میں مستعمل نہیں ہے اور نہ ہی وہاں اس کو لوگ قبول کرتے ہیں۔یہ سراسر مشرق کے رموز ہیں جن سے مشرقی روح جلد خوگر ہو جاتی ہے، گو یہاں بھی انسان اکیلا کچھ نہیں کر سکتا لیکن پھر بھی انسان کو زیادہ تلاش میں سر کھپائی نہیں کرنی پڑتی۔بابوں کا وجود ہمارے کلچر میں عام سی بات ہے۔

مغرب اسی سبب سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ویرانی میں گرفتار ہے۔وہ اندر سے خود کو خالی محسوس کرتا ہے،مذہب ان کی راہنمائی نہیں کرتا اور تعلق سے وہ ویسے ہی عاری رہتے ہیں۔ایسے میں انسان کو منفی سوچیں گھیرے رکھتی ہیں۔وہ ہر حیلا بہانہ کر لیتا ہے لیکن خالی جگہ پُر نہیں کر پاتا۔کیونکہ وہ اللہ کی طرف آنا نہیں چاہتا۔خدا کی راہ میں آنے کے لئے آسائشیں چھوڑنی پڑتی ہیں،دنیا سے دل ہٹانا پڑتا ہے،حدیث نفس کو ختم کرنا ہوتا ہے، قلب کی پاکیزگی دنیا میں رہ کر نہیں ہو سکتی۔اس کے لئے خدا کے ذکر سے لو لگانا ہوتی ہے،خود

کو اللہ کے حوالے کرنا ہوتا ہے، امید کا دامن پکڑنا ہوتا ہے اور منفی سوچوں، اگر مگر سے الگ ہونا پڑتا ہے۔ یہی مصنفہ کے تصوف کا فلسفہ ہے، اسی بنا پر قدرت اللہ شہاب، اشفاق احمد اور خود بانو قدسیہ کو بابے کہا جاتا ہے۔ یہ ادب میں تصوف کے سُر خیل ہیں۔ ان کا ادب قاری کو دنیا سے ہٹا کر بابوں، مرشدوں، پیروں اور فقیروں کی دنیا میں لے جاتا ہے۔ گویا اللہ سے بھٹکے لوگوں کے لئے یہ وجود ایک روحانی ڈاکٹر کی طرح ہوتے ہیں۔ جیسے جسمانی بیماری کے علاج کے لئے جسمانی ڈاکٹر سے رجوع کیا جاتا ہے ایسے ہی مصنفہ کے مطابق روح کے علاج کے لئے بھی ایک روحانی ڈاکٹر درکار ہوتا ہے۔

> "ایک علاج فلاح والوں کا بھی آزما دیکھو۔ اپنے قلب کو ذکرِ اللہ کے حوالے کرو۔ اللہ کے ذکر کے علاوہ اطمینانِ قلب ممکن ہی نہیں۔۔۔
>
> حدیثِ نفسی ختم ہو جائے گی۔ میرے اندر کی منفی سوچیں جنہوں نے مجھے پاگل کر دیا ہے کیا کیا کیا۔ یہ میرا پیچھا چھوڑ دیں گی؟ مسٹر جنک نے سوال کیا
>
> یہاں ایک اسلامک سنٹر میں نائیجیریا کے ایک صوفی جمعرات کی شام کو ذکر کی محفل گرم کراتے ہیں۔ پاسِ انفاس سکھاتے ہیں۔۔ وہاں پہنچ جانا۔۔
>
> آپ وہاں جاتے ہیں چاچا جی۔۔۔
>
> ہاں کبھی کبھار۔۔۔ لیکن تم ضرور جانا۔۔۔ تمہیں فلاحی ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔"(۲۸)

لیکن کیا یہ سب باتیں اتنی ہی آسان ہیں جتنی ہمیں پڑھ کر لگتی ہیں؟ اس کا سیدھا سا جواب نفی میں دیا جا سکتا ہے۔ یہ مقالہ نگار کی رائے ہی نہیں خود بانو قدسیہ کی رائے بھی یہی ہے۔ مشاہدہ ہمارے اس امر کی گواہی بھی دیتا ہے۔ یہ ساری بزرگوں کی باتیں ہیں۔ جوانی میں انسان میں چونکہ دم خم ہوتا ہے اور اگر وہ غریب ہے تو پھر تو دنیاوی کشش اتنی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ لہذا وہ اپنی بھرپور توانائی دنیا کمانے میں صرف کر دیتا ہے اور قسمت ساتھ دے تو وہ اپنی حالت بہتر بھی بنا لیتا ہے لیکن ایسے میں اس کی ساری عمر بھاگ دوڑ میں ہی گزر جاتی ہے۔ پھر جب اس کو دنیاوی مصروفیات سے وقت میسر آتا ہے تو وہ اپنے ارد گرد دیکھ کر افسردہ ہوتا ہے کیونکہ اس کی اولاد آسائشوں میں گرفتار ہوتی ہے۔ جو دولت وہ دن رات ایک کر کے کماتا ہے اس کی اولاد اللوں تللوں میں ضائع کر رہی ہے۔ ایسے میں اس کو دولت ایک لایعنی سی چیز دکھائی دیتی ہے۔

یہ وہ وقت ہوتا ہے جب دل کو سکون درکار ہوتا ہے۔ دین انسان کو دنیا سے زیادہ آسان دکھائی

دینے لگتا ہے۔ بزرگوں اور نیک لوگوں کی محفلیں ان کو اچھی لگتی ہیں۔ وہ خیرات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں شاید کہ ان کی سابقہ کوتاہیوں کا مداواہ ہو سکے!۔ وہی خوشی جو کسی وقت اسے دنیاوی کاموں میں ملتی تھی اب دینی کاموں، دوسروں کی مدد کرنے اور خیرات سے حاصل ہوتی ہے۔ انسان کا ادھورا پن بھرنے لگتا ہے۔ مشرق و مغرب دونوں میں غور کریں تو اکثریتی خیراتی ادارے بزرگ لوگوں نے شروع کئے ہیں۔ نوجوانوں کی ترجیحات ہی الگ ہوتی ہیں۔ لیکن یہی نوجوان جب بزرگی میں قدم رکھتے ہیں تو سارا عالم بدل جاتا ہے۔ روح کے تزکیہ کی فکر لگ جاتی ہے۔ ایک سائیکل، دور، دائرہ ہے جہاں سب گھومتے چلے جا رہے ہیں۔ کردار بدل جاتے ہیں لیکن کہانی ایک سی ہی رہتی ہے۔ نوجوانی مادیت کی طلب گار ہوتی ہے، بڑھاپا روحانیت کا نمائندہ ہے۔ انسان ساری عمر جس خوشی کو مادے میں ڈھونڈ رہا ہے وہ اسے مادے کو چھوڑ کر حاصل ہو رہی ہوتی ہے۔

گو مصنفہ کا منشا ہر دو طبقے، نوجوانوں اور بڑوں کی اصلاح ہے لیکن یہ بات مصنفہ کے تحت الشعور میں بھی موجود ہے کہ نوجوان اس کی بات کا کم اثر لیں گے جبکہ تھوڑی بڑی عمر والے اس کی بات کو بآسانی سمجھ پائیں گے۔ ٹینشن اور فرسٹریشن سے نجات صرف روح کو پاک کر کے ہی مل سکتی ہے:

> ''کیا میں ناکردہ حسرتوں اور گناہوں پر آنسو بہانے کے لئے اتنے سال یہاں رکا رہا؟ کیا واقعی بابا آدم کے اولین گناہ کی پاداش میں میری زندگی پر ائسچت میں گزرنی چاہیے؟ کیا کہیں۔۔۔ کیا انسان اس ادھورے پن کے احساس سے کیوں اور کیسے میں بدل جاتا ہے؟۔۔۔ کیا خوشی کی تلاش سراب کا سفر تو نہیں؟ اصل خوشی انسان کے لئے عنقا ہی نہ ہو؟ سوچتا ہوں جب تک انسان غریب ہوتا ہے اسے جسمانی دکھ چمٹے رہتے ہیں۔ ناداری کا حملہ جسم پر ہوتا ہے لیکن وہ جونہی دولت مند ہو کر عام ماحولیاتی سہولتیں حاصل کر لیتا ہے۔۔۔ ایسے میں جسم کی تمام ضروتیں پوری ہو چکتی ہیں، روح کی انگڑائی لے کر بیدار ہوتی ہے اور اپنے مطالبات پیش کر دیتی ہے، اب غیر مرئی ضرورتیں، نظریات، ذہنی نفسیاتی اڑچنیں، سوال در سوال، خیال در خیال، سوچ کا سلسلہ دراز ہو جاتا ہے، یہ وقت ہوا کرتا ہے جب جسم اور اس کی ضرورت عموماً شانت ہوا کرتی ہیں۔ لیکن روح کی بیزاریاں بڑھنے لگتی ایسے میں اصلی مشکلیں کم اور خیالی مسائل زیادہ ہو جاتے ہیں۔ اب ٹینشن، Anxiety کا دور شروع ہوتا ہے۔ انسان کی روح، نفسیات ذہن بے تاب رہنے لگتا ہے۔ اب پراگندگی کا حملہ باہر سے نہیں ہوتا، اندر

سے غم نصیب انسان آرام دہ زندگی بسر کرتا ہوا مثل آنسو سدا گرنے پر آمادہ رہتا ہے۔"(۲۹)

پس بانو قدسیہ کا سارا فلسفہ اور تصوف روح کی پاکیزگی، غم کی دوری، حقیقی خوشی کے حصول، نجات دہندہ کو ڈھونڈنے پر بابوں کے گرد گھومنے پر مشتمل ہے۔ دنیا سے دل چرانا، آخرت سے دل لگانا اور فلاح کے راستے پر چلنا یہی مصنفہ کا منشا ہے۔ خود بانو قدسیہ کا قبیل اسی محور کے گرد گھومتا رہا اور یہی روح انہوں نے نئی نسل میں پیدا کرنے کی کوشش کی۔ گو ادب حقائق اور ابلاغ پر یقین رکھتا ہے لیکن بہت سی جگہوں پر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے مصنفہ بزور اپنا فلسفہ پہنچانا چاہ رہی ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ بات کیا ہے اور کیسے ہے، آج بھی ادب کا ایک وسیع حلقہ اسی قبیل کی تعلیمات سے متاثر ہے۔

ج۔ ذہنی و نفسیاتی سطحوں میں فرق و امتیاز

i. ذہن اور نفسیات کی تعارفی بحث:

ذہن انسان کے ارتقا کی اولین سیڑھی ہے۔ ذہن نے انسان کی حیوانیت سے انسانیت کی طرف راہ ہموار کی۔ ذہن انسانی افعال کا مرجع و ماویٰ ہے۔ ہر ایک عمل اور ردعمل یہیں سے گزر کر نقش پاتا ہے۔ انسان کا ذہن ایک ایسی چیز ہے جو رکے بغیر کام کرتا ہے۔ یہاں تک کہ نیند کے دوران بھی ذہن متحرک ہوتا ہے، مصروف ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ہم خواب دیکھتے ہیں۔ نیند کے دوران سانس لیتے رہتے ہیں، کروٹیں بدلتے ہیں۔ ذہن کے معنوں میں "حافظہ، یاد، ادراک یا سمجھ کی قوت، زیرکی، دانائی، قابلیت اور ذکا"(۳۰) وغیرہ سب معانی شامل ہیں یا یوں کہنا چاہیے کہ یہ سب الفاظ ایک دوسرے کے متبادل کے طور پر ہی بولے اور جانے جاتے ہیں۔

ذہن ایک غیر مادی چیز ہے۔ جس کا مسکن انسانی دماغ ہے۔ ذہن انسانی تمناؤں، خواہشوں اور ہر قسم کے خیالات کی بنیادی اکائی ہے گویا جسے ہم شعور کہتے ہیں وہ دراصل ہماری ذہنی اپروچ ہی کا دوسرا نام ہے۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی ذہن کے تعارف میں لکھتے ہیں:

"ذہن اس اعتبار سے تو مادی ہے کہ وہ مادی اشیا کے برعکس کمیت، طول، عرض اور عمق نہیں رکھتا اور نہ جگہ گھیرتا ہے۔ لیکن جب ذہن کو مغز سر کی فعلیت کے طور پر دیکھا جائے تو یہ

مادی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں ذہن مادی جسم کے ایک مادی حصے کا عمل ہے۔ ذہن تمناؤں، خواہشوں، اندیشوں اور خیالات و جذبات پر مشتمل ہے اور انہی کے مجموعے کو شعور کہتے ہیں۔"(۳۱)

ہم کیا دیکھ، سوچ اور محسوس کرر ہے ہیں۔ عمل اور رد عمل کیسے وقوع پذیر ہو رہے ہیں اور ہماری یادداشت کیسے چیزوں کو محفوظ کرتی ہے، اس کے لئے ذہن کی تین اصطلاحیں وضع کی گئی ہیں۔

۱: شعور: جو بات ہم زمانہ حال میں جانتے ہیں، شعور میں ہوتا ہے۔ **۲: لاشعور:** جو باتیں، واقعات ہمارے ذہن سے چھوٹ جاتے ہیں، شعور سے نکل جاتے ہیں لیکن فطرت نے ہمارے اندر اس کے متعلق آگاہی ودیعت کی ہو تو وہ لاشعور ہو گا۔ جیسے ہم اگر آگ کو چھونا چاہیں تو احساس ہونے سے پہلے ہی لاشعوری طور پر ہاتھ پیچھے کو کھنچ جاتا ہے۔ **۳: تحت الشعور:** جو باتیں بہت عرصہ گزرنے کے باعث یا غیر اہم ہونے کے باعث ہم شعور سے باہر دھکیل دیتے ہیں، تحت الشعور میں جا کر چھپ جاتی ہیں اور بعض اوقات حالات مدہوشی یا نیند میں بھیس بدل کر لاشعور میں آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جنہیں ہم خواب کہتے ہیں۔

شعور، لاشعور اور تحت الشعور کو ایک سادہ مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ جب ایک انسان کسی نئی جگہ پر جاتا ہے تو وہ اس جگہ تک پہنچنے کا سارا راستہ سمجھ بوجھ اور خیال سے دیکھ بھال کر شعوری کوشش سے طے کرتا ہے۔ مگر جب وہ اس جگہ کا باسی ہو جاتا ہے یا دو چار مرتبہ وہاں چلا جاتا ہے تو پھر اس منزل تک کا سارا راستہ لاشعوری طور پر ہی طے ہو جاتا ہے اور اس کے لئے کوئی خاص غور وخوض نہیں کرنا پڑتا۔ مگر اگر دوبارہ اسی راستے پر اسے چالیس پچاس سال بعد جانا پڑے گا تو اسے اسی راستے کی معلومات تحت الشعور سے اخذ کرنی پڑے گیں۔ گویا سادہ الفاظ میں انسانی دماغ شعور، لاشعور اور تحت الشعور کے تحت ہی اعمال بجالاتا ہے اور اس کے لئے اس کا ذریعہ حواس خمسہ ہوتے ہیں۔ حواس خمسہ کے تحت بھیجا گیا پیغام ہی شعور، لاشعور اور تحت الشعور میں جگہ بناتا ہے۔

اس کے بالمقابل انسان کی انہی ذہنی کیفیتوں، افعال واعمال اور عمل ورد عمل کا سائنسی مطالعہ نفسیات کہلاتا ہے۔ اس مطالعے میں "فرد" کی ہر حرکت و کیفیت کا سائنسی مطالعہ کیا جاتا۔ طارق محمود کے مطابق:

"نفسیات کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے کہ نفسیات فرد کے کردار اور بنیادی افعال یعنی حافظہ، ادراک، تخیل، تفکر اور محرکات کے سائنسی مطالعے کا نام ہے اور وہ فرد کے ان

بنیادی افعال کو طبیعاتی اور حیاتیاتی حقائق سے مربوط کرنے کی کوشش ہے۔"(۳۲)

گویا نفسیات میں فرد بحیثیت ایک اکائی موضوع ہوتا ہے۔ اس میں ذہن میں بھی شامل ہے۔ یعنی ذہن ایک چھوٹی اکائی جبکہ نفسیات ایک بڑی اکائی کا نام ہے جس میں ذہن سمیت دوسری تمام چیزیں بھی شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی نے بھی اسے ایک اکائی کے طور پر ہی لیا ہے۔

"نفسیات ایسا علم ہے جو فرد کے کردار کا سائنسی مطالعہ اس کے ماحول میں کرے۔ نفسیات میں فرد کا مطالعہ بحیثیت فرد کے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔"(۳۳)

نفسیات چونکہ ایک سائنسی علم ہے یہی وجہ ہے کہ اب اس کی بہت سی مزید شاخیں بھی وجود میں آچکی ہیں جس میں فرد کا مطالعہ متعلقہ شاخ کے تناظر میں کیا جاتا ہے۔ جیسے سیاسی نفسیات کے تحت فرد کا سیاسی مطالعہ، عضویاتی کے تحت عضو کا مطالعہ، تعلیمی نفسیات کے تحت فرد کا تعلیمی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ایسے ہی دیگر شاخوں میں سماجی، صنعتی، معاشرتی، طبی، اطلاقی، تجرباتی اور تقابلی نفسیات وغیرہ شامل ہیں۔

ii. حاصل گھاٹ میں کرداروں کی ذہنی و نفسیاتی شناختیں

اچھے ناولوں میں انسانی نفسیات کے گہرے مطالعہ کا موقع ملتا ہے۔ ناول نگار کے مشاہدات قارئین کے شعور کو جلا بخشتے ہیں اور ان کے جذبات میں نکھار پیدا کرتے ہیں۔ ناول "حاصل گھاٹ" میں بھی کرداروں کی جس طرح ذہنی و نفسیاتی کیفیات بیان کی گئی ہے اور جو رنگ دکھائے گئے ہیں۔ وہ صرف کوئی ایسا شخص ہی دکھا سکتا ہے جس نے نفسِ انسانی کا بغور مطالعہ کیا ہو۔ یوں بانو قدسیہ کے ناول "حاصل گھاٹ" کو پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک ماہرِ نفسیات دان تھیں۔ اور وہ بخوبی جانتی تھیں کہ مختلف حالات و واقعات کس طرح انسان کی ذہنی و نفسی کیفیات پر کیا کیا اثر ڈالتے ہیں۔ پس مصنفہ نے ناول میں کرداروں کی ذہنی و نفسیاتی کیفیات اور ان میں ہونے والی شکست و ریخت کو اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے۔

زیرِ بحث ناول متنوع کرداروں کا حسین مرقع ہے۔ ناول کے قابلِ ذکر کرداروں میں ہمایوں، ارجمند، جہانگیر، شاہدہ، اصغری اور اقبال سرِفہرست ہیں۔ ناول کی تمام تر کہانی انہی کرداروں کے گرد گھومتی ہے۔ بانو قدسیہ کی مضبوط گرفت کی بدولت ناول کا ہر کردار اپنی اپنی جگہ ذہنی و نفسیاتی شناختوں کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

۱)ہمایوں فرید

ہمایوں فرید ناول ''حاصل گھاٹ'' کا نمائندہ اور سب سے بنیادی کردار ہے جو ہمیں بانو قدسیہ کی علمِ نفسیات کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔ ناول کا سارا قصہ اسی (واحد متکلم) کی زبانی بیان کیا گیا ہے جو ماضی زدہ اور ماضی پرستی کا شکار ہے۔ اس کا اصل مرض ''ناسٹلجیا'' ہے۔ نفسیاتی توجیح کے مطابق جو لوگ اپنے حال سے مایوس ہو جائیں وہ ماضی میں زندہ رہنے کو ترجیح دیتے ہیں، اس ماضی پرستی کو نفسیات ''ناسٹلجیا'' قرار دیتی ہے۔ اس تناظر میں مصنفہ نے ناول میں ہمایوں فرید کی ذہنی ونفسیاتی کیفیات کو پوری مہارت کے ساتھ زیبِ قرطاس کیا ہے۔

ہمایوں فرید کی کہانی سے ہمیں معلوم ہوتا کہ وہ ایک سادہ اور مشترکہ خاندان میں پیدا ہوا، گھر میں زندگی کی زیادہ آسائشیں موجود نہیں تھیں، لیکن خاندان اقدار کے سہارے آگے بڑھتا رہا، بعد میں ہمایوں کو اقبال نامی لڑکی سے پیار ہو گیا لیکن چونکہ یہ غریب تھا اور اس کی محبوبہ امیر گھرانے سے متعلقہ تھی، اس لئے دونوں کی شادی نہ ہو پائی۔ یہاں سے ہمایوں کے لئے غربت ایک گالی بن گئی، اس نے دن رات ایک کر کے دولت کمانی شروع کر دی، دین و دنیا اور زمانے سے بے پرواہ ہو گیا۔ نتیجتاً اس کو دولت تو وافر میسر آ گئی لیکن وہ ہر رشتے کو راستے میں کھو آیا۔

> ''انہیں میں کیسے بتا سکتا تھا کہ سانده سے ٹمپل روڈ۔۔۔ اور ٹمپل روڈ سے ڈیفنس کی رومن Pillars والی کوٹھی تک میں نے کتنا کچھ گنوا دیا۔ میں بھی ان کو اپنے پانچوں بہن بھائیوں کی صرف پرانی کہانیاں ہی سنا سکتا تھا۔ آنول تو کبھی کٹ چکی تھی۔ کتنے رشتے وقت نہ ملنے کے باعث فل سٹاپ میں بدل گئے۔۔۔ اماں ابا تو خیر قبروں میں جا سوئے۔ ہم پانچوں بھی اپنی اپنی راہوں پر اپنے اپنے بچوں میں گم اپنے اپنے ساتھی کی انگلی پکڑ کر زندگی کی بڑی بھیڑ میں گم ہو گئے تھے۔ زندگی میں دولت کمانے اور صرف کرنے کے علاوہ ہمارا کوئی مصرف نہ رہا تھا۔ پہلے اس کے لئے تگ و دو کرنا پھر اس کو خرچ کرنے یا جوڑے جانے میں مگن رہنا۔''(۳۴)

یہی وجہ ہے کہ ہمایوں پورے ناول میں خود کو کوستا رہتا ہے، ہمیشہ اپنے ارد گرد کچھ ڈھونڈتا رہتا ہے۔ لیکن یہ لاحاصل کی تلاش ٹھہرتی ہے۔ ناول ''حاصل گھاٹ'' کی فضاء دراصل ہمایوں کے ماضی کی داستانوں کی بازگشت ہے۔ اسی لئے ناول میں ناسٹلجیا، کلاسیک سے محبت، ماضی پرستی، ماضی پر نوحہ خوانی اور

روایت میں پناہ کی تلاش نمایاں ہے۔

ہمایوں کی سوچوں اور فکرات کا ایک بڑا محور اس کی محبوبہ اقبال کے گرد گھومتا ہے۔اقبال سے ٹھکرائے جانے نے ہمایوں کو اندر سے کھوکھلا کر دیا۔ہمایوں کو کبھی محبت کرنی آئی بھی نہیں کیونکہ وہ ایک سیدھا سادہ سا مشرقی نوجوان تھا جو روایات کو توڑ نہیں سکتا تھا،والدین سے ڈرنے والا،عواقب کو ہر وقت ذہن میں رکھنے والا ایک مجسم مشرقی انسان۔بنیادی طور پر بانو قدسیہ نے ہمایوں کے ذریعے ہمیں ایک مشرقی انسان سے متعارف کرایا ہے۔کہانی میں مصنفہ نے جب بھی مشرقی روایات کا ذکر کرنا ہو،اپنے نظریے کا پرچا کرنا ہو،اخلاقیات کا لیکچر دینا ہو،ایک دم سے ہمایوں کا کردار سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔

مشرق و مغرب کی سوچ، نظریات،اخلاقیات،اقدار،روایات اور طرز زندگی کے مابین فرق کو ہمایوں ہی عیاں کرتا ہے، کہیں ذہنی و نفسیاتی طور پر اور کہیں عملی و فعلی طور پر۔ہمایوں خود کو صاف،شفاف اور بااصول انسان سمجھتا ہے،جس نے کبھی کسی کا حق نہیں مارا۔لیکن جیسے ہی ہمایوں یہ سوچتا ہے اس کے ذہن میں اصغری(اس کی بیوی)اور اقبال کا خیال در آتا ہے۔وہ جانتا ہے وہ ذہنی طور پر منافقت کا سامنا کر رہا ہے۔بیوی کے ہوتے ہوئے بھی وہ اقبال کی سوچوں میں گم رہتا ہے اور بیوی کی وفات کے بعد اقبال کی تلاش میں امریکہ پہنچ جاتا ہے اس کی نگاہیں ہر جگہ،ہر مجلس اور پارٹی میں اقبال کی متلاشی رہتی ہیں۔

> ”اقبال بھی ایسے ہی ایک تصور تھا جس نے میری زندگی کے سارے مہ و سال ایک خیالی سفر میں بدل دیئے۔۔۔میں بھی اس تصور کی گیند کے پیچھے بھاگتا بھاگتا نہ جانے کتنی مدتوں اندر ہی اندر آوارہ رہا۔شاہد بھائی ٹھیک کہتے تھے۔خیال ریگستان کا سفر ہے۔ میں نے اقبال کے بغیر ساری جوانی مزے میں گزار دی، لیکن اصغری کی وفات کے بعد یہ تعلق پھر ہرا ہو گیا اور سردیوں کا موسم گزرنے پر جس طرح جھونجھ انار کا بوٹا لہلہا اٹھتا ہے ایسے ہی میرے تعلق کے انار میں بڑے خوبصورت شگوفے نکل آئے اور ان میں ان انار کلیوں کو کبھی کبھی سونگھتا، کبھی ان کے رنگ سے مسحور ہو جاتا۔“(۳۵)

بانو قدسیہ کے خیال میں محبت نفسِ انسانی پر بے پناہ اثر ڈالتی ہے۔یہ ایک فطری حقیقت ہے کہ انسان جس سے محبت کرتا ہے اس کا حسن اس کے دل و دماغ پر ہمیشہ کے لئے نقش ہو جاتا ہے۔اسی طرح ناول کا مرکزی کردار ہمایوں فرید کی محبت کا انوکھا انداز ناول میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح وہ اقبال کی محبت میں ناکا

م ہو کر نفسیاتی مسائل کی لپیٹ میں آکر عمر بھر کا روگ لگالیتا ہے۔ مصنفہ نے ناول میں ہمایوں فرید کی ذہنی نفسیات کے حوالے سے بتایا ہے کہ محبت شخصیت کی تعمیر و تکمیل کیلئے کس قدر ضروری ہے۔

ان سب باتوں کے درمیان ہمایوں کو پرانی اقدار کے بکھرنے اور نئی اقدار کے سطحی اور جذباتی ہونے کا دکھ بھی ہے اور وہ بہت سے مواقع پر اس کا اظہار بھی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی ساری زندگی والدین کے ادب، احترام اور ڈر کے تحت گزری۔ ایسے میں جب ہمایوں کا بیٹا اور بیٹی اس سے خوامخواہ کی بحث میں الجھتے ہیں، بیٹا بیوی کے زیر اثر جب والدین کو قدامت پرستی کے طعنے دیتا ہے، بیٹی امریکہ کی اقدار کی حمایت میں دلائل دیتی ہے تو وہ مشرقی روایات کی وکالت کرتا اور اس کی اقدار کی جگالی کرتا نظر آتا ہے۔ اسے امریکہ میں رہنا ایک آنکھ نہیں بھاتا، وہ وہاں صرف اقبال کی آس میں قیام پذیر رہتا ہے ورنہ اس کے بس میں ہوتا تو پہلے ہی دن واپسی کی راہ لے لیتا، اسے اپنے ملک کی یاد شدت سے ستاتی ہے۔ امریکہ میں اقلیتیں جس طرح کی زندگی بسر کر رہی ہوتی ہیں اور جن مسائل سے دوچار نظر آتی ہیں ہمایوں اس پر شدید اعتراضات کرتا ہے۔

اس کا ایک سبب ہمایوں کی عمر بھی ہے۔ ہمایوں عمر کے اس حصے میں ہے جہاں انسان خود کو نیک، پارسا، دوسروں کا خیر خواہ اور ہر کسی کا خیال رکھنے والا سمجھتا ہے۔ اکیلے پن کے سبب ہمایوں بچوں کی کمپنی کے حصول کا طلب گار رہتا ہے لیکن وہ اپنی مصروفیت کے باعث اسے وقت نہیں دے پاتے۔ خود ہمایوں بھی اس سے آگاہ ہے۔ اسی لئے وہ خود سے کہتا ہے: " بوڑھے آدمی کے پاس ویسے بھی کون بیٹھنا چاہتا ہے؟ اور پھر بوڑھے آدمی کے پاس سوچوں کے علاوہ اور ہوتا بھی کیا ہے؟"[۳۶] دراصل بانو قدسیہ نے ناول "حاصل گھاٹ" میں ہمایوں کے کردار کے ذریعے ایک بزرگ کی نفسیات کا بیان بہت ماہرانہ اور دلکش اندازِ بیان سے کیا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو مصنفہ ہمایوں کے کردار کے ذریعے ہمیں یہ بات باور کرانا چاہتی ہیں کہ جب انسان کو ماضی، حال سے زیادہ پر کشش نظر آنے لگے اور مستقبل نظر آنا بند ہو جائے تو سمجھ جائیں کہ انسان اب بوڑھا ہو گیا ہے۔ اس لئے ہمایوں بڑھاپے میں ہر وقت نشہ ماضی میں سر مست رہتا ہے۔ سوچوں ہی سوچوں میں، اندر ہی اندر وہ تنہا رہتا ہے، سوچتا اور کڑتا ہے غمگین ہوتا اور پھر اپنی غمی پر خوشی مناتا نظر آتا ہے۔

> "بوڑھا آدمی ہمیشہ دائرے کا سفر کیا کرتے ہیں۔ انہیں بار بار ایک ہی بات دہراتے رہنے کی عادت بھی اسی لئے پڑ جاتی ہے اور وہ ماضی کی سوچوں کا سفر اسی لئے چھوڑ نہیں پاتا۔ میری عادت ہے کہ نہ تو اپنی خوشی میں کسی کو شامل کر سکتا ہوں، نہ ہی کسی دوسرے کی رسائی

میرے غم تک ہوسکتی ہے۔ اندرونِ صحن دل میں کسی کو تاکنے، جھانکنے کی اجازت نہیں دیتا۔۔۔ اس تنہائی پسندی، پوشیدگی کا میں عاشق ہوں۔ میں لیمن ڈراپ کی طرح اندر ہی اندر خوشی کو چوستا رہتا ہوں اور غم کی چیونگ گم کو چباتے رہنا بھی میرا محبوب مشغلہ ہے۔"(۳۷)

درحقیقت مصنفہ نے نہ صرف ہمایوں فرید کی زندگی کے واقعات کو بڑی خوبصورتی سے جوڑا ہے بلکہ اس کی گفتگو کے ذریعے بھی مصنفہ نے اپنا مقصد اور مدعا بیان کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اور یہ حقیقت واضح کی ہے کہ بڑھاپے میں انسان کے پاس سوائے ماضی کی یادوں اور موت کے انتظار کے کچھ باقی نہیں رہتا۔ بانو قدسیہ نے ناول کے ہیرو ہمایوں فرید کے کردار کو جس خوبصورتی اور گہرائی سے سمجھا اور اس کردار کی ذہنی کشمکش کی پیچیدگی کو سمجھ کر جس طرح ترجمانی کی ہے یہ سب مصنفہ کے گہرے نفسیاتی مطالعہ کی غماز ہے۔ ناول میں ہمایوں فرید کے مطالعہ سے یہ چیز واضح ہو جاتی ہے کہ بانو قدسیہ انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ رکھتی تھیں۔

۲) ارجمند

ارجمند کا کردار بڑی متنوع نوعیت کا کردار ہے۔ ایک طرح سے یہ کردار پورے ناول میں ہمایوں کے مقابل کھڑا نظر آتا ہے۔ ناول میں اکثر جگہوں پر ہمایوں اور ارجمند میں شدید بحث و مباحثہ بھی دکھایا گیا ہے۔ ناول میں ارجمند کا سب سے بڑا حوالہ ہمایوں کی بیٹی کی حیثیت سے ہے۔ جبکہ دوسرا بڑا حوالہ، جس سے ناول کا اکثریتی حصہ بھرا پڑا ہے وہ، مغربی عورت کا نمائندہ کردار کا ہے۔

بانو قدسیہ کے نزدیک اس وقت میدان میں یہ کوئی پانچویں یا چھٹی نسل ہے جو مغربی طرزِ معاشرت اور جدید صنعتی سماج کے زیرِ اثر نہ صرف آنکھ کھول رہی ہے بلکہ مغربی تعلیم و تہذیب کے زیرِ سایہ تربیت بھی پا رہی ہے۔ یہی وجہ کہ ہماری آج کی نسل نے مغربی تہذیب و ثقافت کو تہہ دل سے قبول کر لیا ہے اور اب وہ بھی اسی آزادی کی خواہاں ہیں جو آج کل مغربی معاشرے میں رائج ہے۔ ناول میں جہاں تک ہمایوں کی بیٹی ارجمند کا تعلق ہے تو ناول نگار نے اس کا نفسیاتی تجزیہ بھی بڑی چابکدستی سے کیا ہے۔ ارجمند ایک خوبصورت تعلیم یافتہ، باشعور اور روشن خیال لڑکی ہے۔ اپنے شوہر ڈاکٹر بلال کے ہمراہ شادی کے بعد بہتر مستقبل اور نئی روشنی کی تلاش کے حصول کے لئے امریکہ کا رُخ کر لیتی ہے۔ لیکن غیر سرزمین یعنی امریکہ جاتے ہی ارجمند

اپنی دینی اور اخلاقی اقدار وہاں کی رنگینوں میں بھول جاتی ہے۔ اور وہاں کی جدید طرزِ زندگی، ترقی یافتہ تہذیب کی مادی برکتوں کو حاصل کرنے کے لئے ہر وقت کوشاں اور آزادی نسواں کی علمبردار کے طور پر نظر آتی ہے۔ بلال کے دیکھا دیکھی وہ بھی ایک امریکن ڈاکٹر کے پاس معمولی سی ملازمت اختیار کر لیتی ہے۔

مصنفہ نے نہایت خوبصورتی سے ارجمند کے کردار اور اس کی نفسیات کو تراشا ہے۔ ارجمند کی نفسیات سے یہ ثابت کیا ہے اب وہ مشرقی طور واطوار کو ترک کر کے مغربی اقدار کو محض اس لئے اپنانا چاہتی ہے کہ امریکہ والوں کی نظر میں خود کو ماڈرن ظاہر کر سکے۔ وہ لباس، ڈھیل ڈھول سب میں امریکیوں کی نمائندگی کرنے کی خواہاں ہے۔

> ”ارجمند سلور سپرنگ جاتی ہے ۔۔۔وہ ایک امریکن ڈاکٹر کی receptionist ہے۔ اس کی چلت پھرت میں بڑا اعتماد ہے۔ اس کا لباس ویسا شوخ وشنگ نہیں جیسا وہ لاہور میں پہنتی تھی۔ لیکن اس کے انداز بہت شوخ ہو چکے ہیں۔ امریکنوں کی طرح وہ بھی جینز ٹی شرٹ پہنتی ہے۔۔ ارجمند کو امریکی لباس بہت پسند ہے۔ وہ کہتی ہے یہ امریکی لباس بہت پریکٹیکل ہے۔ اس میں کام کرنا دشوار نہیں۔“(۳۸)

ارجمند بظاہر اس ناول کا ایک موقع پرست کردار ہے۔ بانو قدسیہ نے ناول میں اس کردار کے ذریعے یہ حقیقت دکھانے کی کوشش کی کہ ہمایوں فرید، جو قدامت پسندی اور مشرقی روایات کا امین ہے، کے باطن میں پرورش پانے والی، اس کی اپنی بیٹی، ارجمند اب امریکی زندگی کی چکاچوند میں کس طرح اپنی نئی پہچان بنانے کے لئے سرکرداں دکھائی دیتی ہے۔ وہ امریکہ کی رنگین فضاؤں میں کھو کر اپنی مشرقی تہذیب وثقافت اور دینی واخلاقی قدروں کو نہ صرف گھٹیا سمجھتی ہے بلکہ ان کے خلاف اظہارِ نفرت کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ اب اسے اپنے بزرگوں، اپنے ملک، اپنے ماحول، اپنی ثقافت، اپنی زبان سمیت ہر چیز گھٹیا اور ناپسندیدہ لگنا شروع ہو جاتی ہے۔ ناول نگار چونکہ ارجمند کی نفسیاتی رویے سے پوری طرح آگاہ ہیں اس لئے انہوں نے ارجمند کے اس عمل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کی کہ وہ اب محض اپنے ماضی سے پیچھا چھڑوانے کی خاطر مکمل طور پر مغربی طرزِ معاشرت میں ڈوبتی چلی جارہی ہے۔ جبکہ اس کا باپ ہمایوں، اس کو اس طرح دیکھ کر افسردہ اور نالاں نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب اپنی بیٹی کو یہ سب چھوڑ کر پاکستان جانے کا مشورہ دیتا ہے تو ارجمند کا تلخ جواب کچھ یوں ہوتا ہے:

"ابو آپ بھول رہے ہیں۔ ہم پاکستان کے عذابوں سے نکل کر یہاں آئے ہیں۔ آپ مجھے واپس اسی گھٹے گھٹے ماحول میں گرمی اور دھول میں، احمق جاہل تنگ نظر لوگوں میں بُلا رہے ہیں، جن کا پاس ٹائم غیبت، کھانا، ہلڑ بازی اور بد تمیزی ہے۔۔ اتنے Exposure کے بعد کنوئیں کا مینڈک نہیں بننا چاہتی۔"(۳۹)

بانو قدسیہ چونکہ بات کہنے کا فن بخوبی جانتی ہیں اس لئے وہ پیچیدہ سے پیچیدہ ذہنی و جذباتی واردات کو بڑی خوبصورتی سے بڑے سادہ لفظوں میں کہہ گزرتی ہیں۔ مثلاً ایک بیٹی کے دل میں ماں کے لئے کیا جذبات ہوتے ہیں اس کیفیت کو بیان کرنے کے لئے صرف ارجمند کی خاموشی کا سہارا لیا گیا ہے۔ یعنی ہر معاملے میں خود مختار، آزاد خیال لڑکی اور ماڈرن لڑکی ماں کے ذکر پر مغموم سی خاموشی سی طاری کر لیتی ہے۔ اس "خاموشی" میں معانی کا ایک جہاں آباد ہے۔

"ابو آج میں نے آپ کے لئے شامی کباب بنا کر فریز کر دیئے ہیں بالکل امی کی طرح سبز مرچ اور پیاز سے بھر کر۔۔۔ امی کا نام لے کر وہ خاموش ہو جاتی ہے۔۔۔ سوچتا ہوں ماضی کے لوگ، واقعات، یادیں، ماضی کی پُر اسرار گلیاں ہیں۔ ہم انہیں بھولنا بھی چاہیں۔۔۔ لیکن یہ یادیں ہمیشہ ہمارے تعاقب میں ہو لیتی ہیں۔ جیسے اندھیرے میں چور کے پیچھے کوئی پولیسیا چل رہا ہو۔"(۴۰)

ارجمند امریکہ مادی ترقی کے باوجود جس احساسِ کمتری اور ذہنی کشمکش کا شکار نظر آتی ہے اس کا نفسیاتی تجزیہ بھی مصنفہ نے خوبصورتی سے کیا ہے۔ اس طرح قاری بھی ارجمند کی ذہنی جذباتی و نفسیاتی کشمکش سے بخوبی روشناس ہو جاتا ہے۔ مثلاً اپنی مرضی سے کام کرنے کے باوجود، ناول میں، ارجمند اپنے باپ سے ہر وقت کے کام کے بوجھ اور بلال کی عدم دلچسپی کی شکایت کرتی نظر آتی ہے۔ اسی لئے ارجمند اور اس کا خاوند بلال جب بھی دونوں اکٹھے ہوتے ہیں ایک دوسرے سے احساسِ برتری ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ارجمند سمجھتی ہے کہ وہ دنیا کی مظلوم ترین عورت ہے، اس کا شوہر اس کی پروا نہیں کرتا۔

"اب وہی بحث چل نکلتی ہے جو آج کے ماڈرن میاں بیوی کی زندگی میں زہر گھولتی ہے۔ دونوں اپنے آپ کو over worked, misunderstood اور under appreciated لیکن نیک دل سمجھتے ہیں۔"(۴۱)

پس ارجمند کے کردار میں ماڈرن زمانے کی خواتین والی ساری عادتیں موجود ہیں۔ اسی سبب ارجمند ناول کا ایک جاندار لیکن باغی کردار ٹھہرتا ہے۔ ایک ایسا کردار جو اپنی مرضی سے چل پھر سکتا ہے، کام کاج کر سکتا ہے، سوچتا اور غور و فکر کرتا ہے۔ وگرنہ ہمایوں کا کردار تو روایات میں جکڑا، معاشرے کا اسیر کردار معلوم ہوتا ہے۔ جہاں ہمایوں ناول میں مشرق کی نمائندگی کرتا ہے وہیں ارجمند مغرب کی نمائندگی میں محو نظر آتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے متضاد کردار ہے۔ لیکن یہی دونوں کردار ناول کو جاندار بناتے ہیں۔ کہانی کو آگے بڑھانے میں دونوں کردار معاونت فراہم کرتے ہیں۔

۳) جہانگیر

ناول کے کرداروں میں ایک اہم کردار ہمایوں کے بیٹے جہانگیر کا ہے۔ جو نہایت شریف، سعادت مند، سلجھا ہوا، ذہین اور مڈل کلاس طبقہ سے تعلق رکھنے والا نوجوان لڑکا ہوتا ہے اور اپنی علمی قابلیت کی بنا پر ایم بی بی ایس (ڈاکٹری) کی ڈگری حاصل کرلیتا ہے۔ جہانگیر کی ماں نے اس کی تربیت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ چھوڑا لیکن جہانگیر میں ایک خامی رہ جاتی ہے۔ چونکہ اس کی ماں نے ساری زندگی فرمانبرداری کے لبادے میں گزاری ہوتی ہے۔ اسی سبب جہانگیر میں بھی قوت ارادی اور قوت متاثرہ پیدا نہیں ہو پاتی۔ یوں وہ جہانگیر جو شادی سے پہلے تک معاشرے کا کامیاب ترین نوجوان تھا، شادی کے بعد بیوی کی قوت متاثرہ کے منہ زور سیلاب کے آگے پسپائی اختیار کرلیتا ہے۔ دوسرا اس کی شادی اپنے سے اونچے طبقے میں ہو جاتی ہے۔ اس سبب وہ کبھی خودداری کا مظاہرہ ہی نہیں کر پاتا۔

گو شادی وہ اپنی مرضی اور پسند کے مطابق اپنی کلاس فیلو شاہدہ سے کرتا ہے۔ لیکن شاہدہ چونکہ ایک اونچے سیاسی خاندان سے تعلق رکھتی ہے اس لئے جہانگیر ہمیشہ اس کے سامنے انتہائی احساسِ کمتری کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ شاہدہ ماڈرن لڑکی ہونے کی وجہ سے انتہائی بے باک ہے۔ وہ بات بات میں جہانگیر کے سٹیٹس پر طنز کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود کو ہمیشہ کنوے کا مینڈک اور گٹر کا کیڑا سمجھنے لگ جاتا ہے۔

> ”شاہدہ میں ایک خوبی ہے اباجی۔ وہ وقت کی ضرورت کے تحت بہت جلد تبدیل ہو جاتی ہے ۔۔۔ اسے چھوڑ کر راستہ بدل کر، غلط یا درست فیصلہ کرکے دیر تک احساس جرم نہیں ہوتا۔ وہ Move over میں یقین رکھتی ہے۔ میں بند گڑ ہوں۔ ایک بار Choke ہونے لگے تو پھر ہوتا ہی چلا جاتا ہے۔۔“[۴۲]

جہانگیر کا اصل روپ شادی کے بعد ہی نظر آتا ہے۔پہلے وہ ایک سلجھا ہوا، فرمانبر دار اور نیک، شریف بیٹا تھا لیکن شادی جہانگیر کو مکمل طور پر تبدیل کر دیتی ہے۔ شادی سے پہلے وہ والدین کی خدمت میں حاضر رہتا تھا لیکن شادی کے بعد اسے والدین قدامت پرست، پرانی سوچ کے حامل اور نچلے طبقے کے نمائندے لگنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اسی سبب وہ انہیں چھوڑ کر بیوی کی ایما پر اپنے سسرال جا کر رہنا شروع کر دیتا ہے۔ سسرال میں رہنے کی وجہ سے اس کا معیار زندگی بھی بدل جاتا ہے۔ وہ فیکٹری میں اچھی نوکری پر لگ جاتا ہے۔ دن رات محنت کرتا ہے اور دنیا میں اپنا سٹیٹس بنانے کی تگ و دو میں مصروف نظر آتا ہے۔

لیکن جانوروں کی طرح کام کرنے سے وہ خود سے غافل ہو جاتا ہے، بیوی بچوں سے غافل ہو جاتا ہے۔ اپنے ماں باپ کے پاس جانا انتہائی کم کر دیتا ہے۔ نوافل کی تلاش میں فرائض سے روگردانی برتتا ہے۔ ایسے میں اس کی صحت بھی متاثر ہونے لگتی ہے۔ وہ ڈاکٹری کا پیشہ ترک کر کے سول سروس میں جانے کا ارادہ کرتا ہے کیونکہ اس کی بیوی کو ڈاکٹری میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ جیسے جیسے اس کی بیوی چاہتی جاتی ہے وہ ایک فرمانبر دار شوہر کی طرح اس کی بجاآوری کرتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ والدین سے کلیتاً روگردانی کر بیٹھتا ہے اور امریکہ کے لئے رختِ سفر باندھ لیتا ہے۔ جہانگیر کا کردار ایک طرح سے خادم یا ایک ربورٹ کا سا کردار ہے، جہاں اس کی بیوی اس کو موڑنا چاہتی ہے وہ مڑ جاتا ہے، جیسے شاہدہ کا منشا ہوتا ہے ویسا ہی عمل جہانگیر بجالاتا ہے۔

اس سارے عمل سے گزر کر جہانگیر اپنی انفرادیت کھو دیتا ہے۔ ہشاش بشاش، صحت مند نوجوان اب کمزور ہوتا چلا جاتا ہے۔ پریشانیاں اس کو گھیرے رکھتی ہیں۔ وہ خود کو نامکمل سمجھنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ ایک لمبے عرصے کے بعد والدین سے ملنے کے لئے آتا ہے تو ہمایوں سے تھوڑی دیر کے لئے پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔

> ''سامنے جہانگیر کھڑا تھا۔ جب اس کی شادی ہوئی تو اس کا قد پانچ فٹ گیارہ انچ تھا۔ رنگ سفیدی مائل گندمی آنکھیں روشن اور مسکراتی ہوئی۔ اب وہ درمیانے قد، سانولے چہرے اور اداس آنکھوں والا نوجوان تھا۔ باڈی بلڈنگ کے شوقین جہانگیر کے کندھے خمیدہ، دانت زردہ اور ناخن میلے تھے۔ اسے دیکھ کر یبوست منحوسیت کا خیال آتا۔''(۴۳)

وہ جہانگیر جو شادی سے قبل اپنی ماں کا اکلوتا، لاڈلا اور من چاہا بیٹا ہوتا تھا، شادی کے بعد شاہدہ کے

سامنے نفسیاتی طور پر دبا دبا سا دکھایا گیا ہے۔ شادی کے بعد سے ہی اس کے رویے میں سرد مہری پیدا ہو گئی تھی۔ صورتحال تب بدلتی ہے جب جہانگیر اور اس کی بیوی امریکہ میں وارد ہوتے ہیں۔ امریکہ میں چونکہ زندگی نہایت تیز رفتار ہوتی ہے اور دونوں میاں بیوی کو کام کرنا پڑتا ہے، اسی سبب انہیں گھر والوں کی یاد ستانے لگتی ہے۔ کیونکہ وہ بچوں کی نگرانی نہیں کرپاتے اور کسی اور کو وہ یہ ذمہ داری دے نہیں سکتے۔

اسی سبب جہانگیر اور اس کی بیوی کو ہمایوں کی یاد ستانے لگتی ہے اور وہ بار بار فون کر کے ہمایوں کو امریکہ آنے کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسا اصرار کرتے ہوئے شاہدہ کا تو کچھ نہیں جاتا لیکن اپنی تربیت کے سبب جہانگیر شرم سے پانی پانی ہوا جاتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ وہ اپنے مقصد کے لئے اپنے والد کی منت سماجت کر رہا ہے وگرنہ مطلب کے بغیر شاید وہ کبھی والد کو یاد بھی نہ کرتا۔

الغرض بانو قدسیہ نے جہانگیر کے کردار کو ایک آزاد کردار کی بجائے بیوی کے زیر اثر ایک ٹائپ کردار کے طور پر پیش کیا ہے۔ بظاہر مصنفہ یہ دکھانا چاہتی ہیں کہ مرد کو قوام بنایا گیا ہے، اس سبب اسے فیصلے کسی پریشر کے بغیر خود سے کرنے چاہییں۔ اس میں قوت متاثرہ کی بجائے قوت مؤثرہ ہونی چاہیے۔ لیکن ناول میں احساس محرومی اور خود اعتمادی کی کمی جہانگیر کے سب سے بڑے دشمن نظر آتے ہیں۔ وہ بیوی کی سوچ کے ماتحت ہمیشہ ترقی کی دوڑ میں شامل رہتا ہے۔ وہ پاکستان میں بھی ماڈرن بننے کی تگ دو میں مصروف رہتا ہے اور امریکہ جا کر بھی جانوروں کی طرح کام میں جت جاتا ہے۔ دماغ سے سوچنے سمجھنے کا ملکہ ایک طرح سے وہ چھوڑ ہی دیتا ہے اور بیوی کی کامل اطاعت کا نمونہ بن جاتا ہے۔

۴) شاہدہ

بانو قدسیہ کے ناول حاصل گھاٹ کے کردار ماورائی نہیں بلکہ ان کے آس پاس بسنے والے لوگ ہی ان کے پسندیدہ کردار ہیں۔ انکے ہاں پڑھے لکھے، ان پڑھ، امیر غریب، نیک، بد، اچھے برے ہر طرح کے کردار موجود ہیں۔ تاہم بانو قدسیہ اپنے کرداروں کے ساتھ مکمل انصاف کرتی ہیں۔ ناول میں شاہدہ اس کی بہترین مثال ہے جو ایک پڑھی لکھی، ماڈرن اور امیر باپ کی بیٹی ہونے کے ناطے بالکل ایک نئی نسل کی لڑکی کا ذہن رکھتی ہے۔

شاہدہ چونکہ ایک اونچے سیاسی خاندان اور ماڈرن لائف سٹائل کی پروردا ہے، اسی سبب وہ اپنی تہذیب، عادات، چلت پھرت کے اعتبار کے سے اپر کلاس طبقے کی نمائندگی کرتی ہے۔ وہ نہ صرف پھوہڑ، بے

سلیقہ، بدزبان، نک چڑھی اور ضدی ہے بلکہ جاگیر دارانہ ذہنیت، تکبر، جوڑ توڑ اور احساسِ برتری کا مجسم نمونہ ہے۔شاہدہ کا کردار اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں اشرافیہ یعنی ایلیٹ کلاس ایک ایسا طبقہ ہے جو بااثر ہونے کے ساتھ ساتھ مذہب سے بیزار بھی ہے۔

شاہدہ چونکہ اشرافیہ (ایلیٹ کلاس) کے طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔اس لئے اس کے کردار میں اخلاقیات کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔یہ مغرب کی مقلد اور من موجی مخلوق ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کے ذہن میں خود توقیری سمائی رہتی ہے۔اسی سبب شاہدہ اپنی ذات سے باہر نکل کر کچھ دیکھ ہی نہیں پاتی۔اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد اپنا سٹیٹس برقرار رکھنا اور اپنی ناک اونچی رکھنا ہے۔وہ اپنے خاوند اور سسرال والوں کے ساتھ انتہائی غیر مہذبانہ زبان استعمال کرتی ہے۔شاہدہ ہمیشہ جہانگیر کو اس کی غربت کے طعنے دیتی اور والدین سے متنفر کرتی نظر آتی ہے۔

> ”تم مجھے دے ہی کیا سکتے ہو باسٹرڈ؟ تمہارے پاس ہے ہی کیا دینے کے لئے ایک سیکنڈ ہینڈ سوزوکی کار۔۔۔یہ Bitchy ہاؤس، ایک نالائق کک۔۔۔ایک ہاف Baked باپ۔۔۔ایک پاگل ماں۔۔۔یہ سب کچھ دینے کے لئے تم نے شادی کی تھی مجھ سے۔۔۔ میں نے تمہاری خاطر اپنے ممی ڈیڈی کا دل توڑا۔۔۔ساری فرینڈز چھوڑیں۔اس ڈرٹی پجن ہول میں آکر انہوں نے میرا ہی مذاق اڑانا تھاناں۔اتنی ساری قربانی کا یہ صلہ دیا تم نے جہانگیر؟ تم اتنا بھی Realize نہیں کرتے کہ اس Un hygeinic جگہ میں میرا بچہ نہیں پل سکتا۔۔۔کچھ باتیں تمہیں بھی ماننا ہوں گی جہانگیر۔۔۔ ایک بڈھے پھوس جوڑے کیا خاطر ہم اپنی زندگی کا پیٹرن برباد نہیں کرسکتے ہاں۔“(۴۴)

گویا شاہدہ کے ذریعے بانو قدسیہ نے ایلیٹ کلاس اور جہانگیر کے ذریعے مڈل کلاس کی عکاسی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاہدہ ہر جگہ امیر لوگوں کی طرح رعب جھاڑتی ہے، دولت کے سر پر اتراتی ہے، بار بار جہانگیر کو اس کی کمتری اور اپنے جاہ و حشمت کے طعنے دیتی ہے۔لیکن یہ سب پاکستانی دولت کا خمار ہوتا ہے اسی سبب جب جہانگیر اور شاہدہ امریکہ جاکر دوسروں کے سٹیٹس کے برابر بلکہ نچلے سٹیٹس میں زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں تو ان کی عقل ٹھکانے آجاتی ہے۔لیکن یہاں بھی بانو قدسیہ نے انسانی نفسیات سے آگاہی کا ثبوت دیتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ پردیس جاکر پتھر سے پتھر دل انسان میں بھی محبت اور رحم دلی کے جذبات ضرور پیدا ہو جاتے ہیں۔اسی لئے کہیں نہ کہیں، کبھی نہ کبھی غیر محسوس طریقے سے اپنا اظہار بھی

کرتے ہیں۔ وہ ہمایوں یعنی اپنے سسر کو اپنے گھر بلانا چاہتی ہے۔ مگر تب تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے اور اس کا سسر بھی انہیں ملنے سے احتراز برتتا ہے۔

"ابو آپ پلیز کچھ دن کے لئے ہمارے پاس آجائیں" بہو شاہدہ کہتی ہے۔۔

شاہدہ پاکستان والی بہو نہ تھی۔ یہاں فیملی نہیں تھی، اس لئے اس میری بھی کچی پکی ضرورت تھی۔"(۴۵)

پس شاہدہ کے کردار میں مصنفہ نے اوپر ماڈرن بہوؤں کی عکاسی کی ہے۔ ایسی بیویاں خاوند اور اس کے گھر والوں کے لئے ہمیشہ شرمندگی کا موجب بنتی ہیں۔ شاہدہ کے کردار کے دوبدوں بانو قدسیہ نے اصغری کا کردار رکھا ہے جو مجسم شفقت اور محبت ہے اور ساتھ ہی شاہدہ کا کردار رکھ کر دونوں کا موازنہ کر دیا ہے اور نتیجہ قاری کی فہم پر چھوڑ دیا ہے۔

۵) اصغری

اصغری کا کردار اس ناول میں ہمایوں کی بیوی ہونے کی حیثیت سے آیا ہے جو ایک نہایت سلجھی ہوئی، پاکیزہ دل اور نیک چال چلن کی مالک عورت ہے۔ ہمایوں کے بقول اس کے اعادات و اطوار نہایت شریف بیویوں جیسے ہیں۔ کیونکہ بچپن ہی سے اصغری کی تربیت کچھ اس انداز سے ہوئی تھی کہ اس میں دینی، مذہبی، اخلاقی اور گھر داری کے فرائض کی ادائیگی کی خصوصیات راسخ ہو گئی تھیں۔ بزرگوں کا ادب، چھوٹوں سے محبت، خدمت گزراری اور مہمان نوازی کی اس میں خوبیاں تھیں۔ اس لئے شادی کے بعد وہ نہ صرف، پرہیز گار، فرمابردار، بلکہ نیک سیرت، نیک دل، اور وفا شعائر بیوی بھی ثابت ہوئی۔ چونکہ اس نے اچھی تربیت پائی تھی اس لئے شادی کے بعد دونوں کے درمیان نہ تو کبھی کوئی جھگڑا ہوا اور نہ ہی ان دونوں کو ایک دوسرے سے کوئی پریشانی لاحق نہ ہوئی۔ چنانچہ اصغری نے گھر کا سارا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنی سلیقہ مندی اور سگھڑ پن کی بدولت اس گھر کا نقشہ بدل دیا۔ اصغری نے اپنے دونوں بچوں، جہانگیر اور ارجمند کی پرورش کے سلسلے میں دینی اور دیناوی دونوں اعتبار سے اچھی تربیت کا اہتمام کیا۔ اس کا سب سے بڑا جوہر اس کا خلوص ہے۔ دنیا میں کہیں بھی کسی کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک پر اس کا دل کڑھتا ہے۔ جس کی بنا اس کو ایک اچھے ذہن اور نرم دل کا کردار گردانا جاسکتا ہے۔

"میری بیوی اصغری اچھی عورت تھی، اچھائی عورت کا سب سے بڑا وصف ہوا کرتا تھا۔ اس کی عادتیں، سوچ، رہنا، سہنا، مذہب سے وابستگی سب مڈل کلاس ہوا کرتی تھیں۔ اس نے کبھی چاچا صمد کی طرح کسی کو شاک کرنے کے متعلق نہ سوچا تھا۔۔۔۔ ہم میں عام میاں بیوی جیسے جھگڑے، چخ چخ نہیں تھی۔۔۔"(۴۶)

اصغری کا کردار مشرقی عورت کا مثالی کردار ہے۔ مشرق، جہاں خاوند مجازی خدا ہوتا ہے، عورت گھر کے سارے امور کی نگرانی کرتی ہے اور گھر بیٹھی خاوند کی راہ تکتی رہتی ہے۔ غرض اپنے طور اطوار کے لحاظ سے اصغری مجسم مشرقی بیوی ثابت ہوئی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ ایک مشرقی عورت اور بیوی ہونے کے ناتے اصغری پیار محبت، خلوص، ایثار، عزت، قربانی، صبر، انسانی ہمدردی، مامتا، ایثار، محبت، معصومیت، سادگی اور شرم و حیا کی پیکر تھی۔ مامتا کے جذبے سے لبریز نیک سیرت، نیک دل، نیک ذات عورت۔ اصغری کا کردار ایک حساس، خوددار اور انسانی ہمدردی سے بھرپور عورت کا کردار ہے۔ یہ کردار انسانی جذبات، محبت اور زندگی سے سمجھوتہ کرنے والا کردار ہے۔

"لیکن میں آپ کو اصغری کے متعلق وثوق سے بتا سکتا ہوں کہ وہ پوری کی پوری ماں تھی۔ اگر اس میں کہیں عورت پن موجود تھا تو اس روپ کو اس نے اپنے خیالوں سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دی۔۔۔ اپنے خیالوں میں نہ جانے اس نے کیسی پینگیں چڑھائیں کیسی کیسی عیاشی کی۔ خیال کی مئے گلرنگ سے میں نے اس کا چہرہ بھی کبھی تمتمایا ہوا نہ دیکھا۔ میرا خیال ہے اصغری کے جینز ترقی کرنا نہیں جانتے تھے۔ وہ پشتوں کی تربیت کا نچوڑ تھی، وہ جھگڑے اور فساد سے نا آشنا اس دارالمحن میں آئی اور کسی قسم کی ترغیب دلائے بغیر کسی سیب کے درخت کو چھیڑے بنا ہی رخصت ہوگئی، اس کے بعد میری زندگی خالی کوکا کولا کی بوتل تھی۔"(۴۷)

اصغری چونکہ ایک گھریلو عورت تھی یہی وجہ ہے کہ جب تک وہ گھروں کے کاموں میں مگن رہی وہ زندہ اور چلتی پھرتی رہی۔ لیکن بڑھاپے میں ایسی عورتوں کو پوتوں، پوتیوں کی ضرورت ہوتی ہے جو انہیں مصروف رکھتے ہیں۔ ایسے بوڑھی عورتوں کو دن اچھا گزر جاتا ہے اور انہیں جلدی بیماریاں بھی نہیں پکڑتیں۔ لیکن اصغری کا بیٹا اور بیٹی اپنے بچوں سمیت امریکا سدھار جاتے ہیں۔ ایسے میں ہمایوں تو اپنے مضبوط اعصاب کے سبب گزارا اور صبر کر لیتا ہے لیکن اصغری چونکہ ایک مشرقی عورت ہوتی ہے اس لئے اس سے یہ غم سہا

نہیں جاتا وہ اسے اپنی تربیت کی خامی سمجھتی ہے جس کی وجہ سے اس کی اولاد اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ اوپر سے اصغری کو بہو بھی بہت تیز طبیعت کی ملتی ہے جو ایسے بوڑھوں کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تھی۔ اسی سبب وہ اپنا سسرال چھوڑ کر پہلے اپنے میکے اور پھر امریکہ چلی جاتی ہے۔

ان سب باتوں کا اصغری کو نہایت قلق ہوتا ہے اور وہ یہ غم سہہ نہیں پاتی اور اس دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے۔ وہ جب تک زندہ رہی پورے گھر کو سنبھالتی رہی، بچوں کی ساری تربیت اس نے اپنے ذمے لی ہوئی تھی۔ ہمایوں کو کبھی اس کی فکر کرنی ہی نہیں پڑی۔ بلکہ خود ہمایوں کو اصغری نے ایک بچے کی طرح پالا اور اس کا خیال رکھا۔

> ''وہ نہ صرف اپنے بچوں کی ماں تھی بلکہ مجھے بھی اس نے ممتا کی چادر میں لپیٹ لیا تھا۔ اسی ممتا کی وجہ سے اس کے ساتھ رہنا آسان تھا۔ اس یں کسی قسم کا چیلنج، مقابلہ، بدتمیزی، گستاخی نہ تھی۔ جب ارجمند اور جہانگیر اپنے اپنے دائروں میں گھومتے امریکہ بدر ہو گئے تو ماں کا جینا دوبھر ہو گیا۔''(۴۸)

ایک اور جگہ پر ہمایوں اصغری کا تعارف کچھ یوں کرواتا ہے۔

> ''اصغری سائبان سی عورت تھی۔ ہر وقت سایہ کرنے، دینے، ہونے کے مرحلوں میں رہتی۔ گھر پہنچ کر میں بچوں کی طرح آزاد ہو جاتا۔ آرام دہ بیوی مجھے اسیری کا محتاج بنا دیتی، میں اسی محتاجی کا عادی ہو گیا جو اچھی عورت پیدا کر دیا کرتی ہے۔''(۴۹)

بانو قدسیہ نے ناول میں نفسیاتی پہلوؤں اور انسانی شعور کی مختلف سطحوں کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اصغری کا کردار ایک طرح سے خود بانو قدسیہ کا اپنا کردار بھی ہے۔ بانو قدسیہ مشرقی عورت کی پُرزور داعی تھیں۔ اسی سبب مغربی عورت کے ذکر کی ذیل میں ان کا انداز طنزیہ جبکہ اصغری، جو مشرقی روایات کی امین ہے، کے کردار کے ذکر کی ذیل میں ان کا انداز ہمدردانہ ہو جاتا ہے۔ پورے ناول میں اصغری کے کردار کو بہت اچھے طور پر سراہا گیا ہے۔

۶) اقبال

اقبال جو بظاہر مردانہ نام لگتا ہے، حقیقت میں ایک مسحور کن نسوانی کردار ہے۔ لیکن یہ ناول کا کوئی ایسا کردار نہیں جو سامنے آ کر کرشمے دکھاتا ہو یا ناول کے اہم امور میں مشغول ہو۔ یہ ایک طرح کا ناول کا

غائبانہ کردار ہے۔ اختتام کو چھوڑ کر پورے ناول میں ہمیں بظاہر اقبال کہیں نظر نہیں آتی لیکن مرکزی کردار کے منہ سے اس کا اتنا ذکر ہوتا ہے اور ہمایوں، اقبال کو اتنی شدت سے تلاشتا ہے کہ قاری لامحاملہ اس کردار کی جستجو میں مگن نظر آتا ہے۔

اقبال، ہمایوں کی محبوبہ ہے جو کہ ہمایوں کی بڑی بہن رفعت آپا کی سہیلی ہوتی ہے۔ اس کی گفتگو، نشست و برخاست کے آداب، عادات و اطوار میں ایک خاص طرح کی کشش پائی جاتی ہے۔ ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود بڑی مدبر، سلیقہ اشعار، خوش اخلاق، ملنسار اور باوقار شخصیت کی مالک ہے اور اعلیٰ ادبی ذوق بھی رکھتی ہے۔ اقبال ایک غائب کردار ہونے کے باوجود پورے ناول پر چھائی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ روشن اور بیدار ذہن کا حامل یہ ایک سلجھا ہوا کردار ہے جو غور و فکر کرنے والا ہے۔ یہ ایک روشن خیال لڑکی ہے۔ انہیں خصوصیات نے ہمایوں کو اقبال کا گرویدہ بنا دیا لیکن یہی باتیں ہمایوں کو احساس کمتری میں بھی مبتلا کر دیتی تھیں۔

> ''جب بھی آپیا اپنے سسرال سے آتی، اس کی کالج کی دوست اقبال ضرور ملنے آتی۔ اقبال کی وضع قطع، لباس انداز سب اونچے سرکاری افسروں کی طاقت کا غماز تھے۔ اسے دیکھ کر مجھے اور شاہد بھائی کو احساسِ کمتری کا سامنا رہتا۔''(۵۰)

اقبال کا کردار رومانویت کے ساتھ ساتھ ادبیت کا عنصر بھی لئے ہوئے ہے۔ اسے شعر و ادب سے بھی دلچسپی ہے۔ اسی سبب اس کے خیالات و نظریات میں بہت وسعت پائی جاتی ہے۔ اقبال کے خیالات کی ہمایوں کی زبانی قاری کو زیادہ شناسائی نہیں ہو پاتی، لیکن ناول کے اختتام میں جب اقبال ہمایوں کے خیالات سے نکل کر مجسم صورت میں سامنے آتی ہے تو اس کی گفتگو قاری کو مسحور کر دیتی ہے۔ وہ نہایت ٹھہر ٹھہر کر بات کرتی ہے اور اس کی گفتگو میں گہرائی پائی جاتی ہے۔ دنیا کا سطحی علم گفتگو سے نہیں جھلکتا۔

مگر باقی کرداروں کی طرح یہ کردار بھی اختتام میں ٹریجیڈی سے دوچار نظر آتا ہے۔ وہ اقبال جسے ہمایوں قریہ قریہ ڈھونڈتا رہا اور ڈرتا رہا کہ شاید وہ زندگی میں خوش ہو گی، بالکل الٹ صورتحال اختیار کر گیا۔ اقبال کی شادی بھی ایک ادبی شخصیت سے ہوتی ہے جسے لوگوں میں بہت پذیرائی حاصل ہوتی ہے۔ اسی سبب اقبال کا خاوند نثار اپنی شخصیت کے سحر میں زیادہ گرفتار نظر آتا ہے، جس سے اقبال پس پردہ چلی جاتی ہے۔ دونوں کی ایک ہی بچی ہوتی ہے جو ابنارمل ہوتی ہے لیکن اس کا نثار سے زیادہ اقبال کو غم ہوتا ہے اور وہ اس کے علاج کے لئے دربدر کی ٹھوکریں کھاتی ہے۔ اپنی اسی بیٹی کے علاج کے لئے وہ امریکہ آئی ہوتی ہے جہاں

اس کی ملاقات ہمایوں سے ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ چاہتے ہوئے بھی ہمایوں کی طرف التفات نہیں برتتی اور اپنی سوئی ہوئی محبت کو جگانے سے معذوری ظاہر کرتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ ہمایوں کو اپنی بچی کی خاطر امریکہ چھوڑنے کی درخواست بھی کر دیتی ہے تاکہ اس کے دل میں محبت کی ہلکی سی چھنگاری بھی نہ سلگے۔

> ”میں۔۔۔؟ میں اب کسی امید کو اپنے اندر جنم دے کر بھسم نہیں ہونا چاہتی۔ اتنی مدت میں نے ہر صبح مونا کے لئے امید کا دِیا جلایا اور رات کو اسے بجھا کر سوئی۔ میں مدت سے پہلے مر چکی ہوں ہمایوں! اب جو بھی مجھے پھونک مار کر زندہ کرئے گا میرا دشمن ہو گا۔۔۔میں سیلینگ بیوٹی نہیں ہوں۔ مجھے کوئی پرنس چارمنگ درکار نہیں۔۔۔میرے اندر ایک صحرا ہے ہمایوں! مجھے محبت نہیں چاہیے۔ شاید میں کسی کا خدا بننا چاہتی ہوں۔ ایب نارمل مونا کے ساتھ رہ رہ کر میں نارمل نہیں رہی۔۔۔ خدا کے لئے چلے جاؤ۔۔۔ اگر تم نے امریکہ نہ چھوڑا تو میں کسی اور جگہ چلی جاؤں گی۔۔۔ اور میرا یہاں ٹھہرنا مونا کی صحت کے لئے ضروری ہے، بہت ضروری۔ وہ کچھ نارمل ہو رہی ہے ہمایوں جی!“(۵۱)

گویا مصنفہ نے اقبال کی شکل میں انسانی خواہشات کی لاحاصلی کی تصویر کشی کی ہے۔ ضرورت نہیں کہ انسان کی ہر خواہش پوری ہو۔ ہر کسی کی زندگی کسی نہ کسی رنگ میں نامکمل ہے۔ مکمل ذات صرف خدا کی ہے باقی سب انسان مجبور، لاچار اور لاحاصلی کی گھن چکر میں محور پرواز ہیں۔ ہمایوں، اقبال کی خاطر زندگی میں سب کچھ پا کر بھی اقبال کو ہار جاتا ہے۔ جبکہ اقبال سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اپنی بچی کے خالی پن کے سبب گرفتارِ آزمائش ہے۔

غرض ہم دیکھتے ہیں کہ بانو قدسیہ نے ناول ”حاصل گھاٹ“ میں پاکستان اور امریکہ کی علمی شناختوں کو نہایت عمدگی سے موضوع بنایا ہے۔ پاکستان چونکہ مادی ترقی اور سائنسی اور علمی حوالے سے آج امریکہ اور باقی مغربی دنیا سے پیچھے ہے اس لئے مصنفہ نے اس حوالے سے امریکہ اور مغربی دنیا کی تعریف کی ہے۔ مصنفہ نے نزدیک آج کی جدید ترقی اور سہولیات کا سارا کریڈٹ مغربی اقوام کو جاتا ہے۔ یہ ان کی محنت ہے جس نے انہیں آج یہ مقام دلوایا ہے۔ امریکہ کا سارا نظام خود کاری کی طرف جا رہا ہے۔ ذرائع مواصلات ہو، برقیات یا ذرائع نقل و حمل سب میں آج مغرب کا طوطی بول رہا ہے۔ تمدنی ترقی کے تحت مغرب جدید سے جدید اور اونچی سے اونچی عمارتیں بناتا چلا جا رہا ہے، خوبصورت سے خوبصورت سڑکیں بنا رہا ہے، صنعتیں سونا اگل رہی ہیں، یہ سب مغرب کی مادی اور تمدنی ترقی کا شاخسانہ ہے۔

اس کے برعکس مشرق ،مادی علمی حوالے سے مغرب سے بہت پیچھے ہے۔ یہاں کوئی قابل ذکر ایجاد نہیں ہو رہی۔ ہم ابھی ماضی کے تمدن کے تحت زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہمیں ٹیکنالوجی سے کوئی زیادہ سروکار نہیں۔ مصنفہ کے نزدیک ہم ابھی بھی سطحی جھگڑوں میں ہی الجھے ہوئے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں کہ مشرق ہر حوالے سے مغرب سے پیچھے ہے۔ مصنفہ کے نزدیک مشرق روحانی علم اور روحانی ترقی میں مغرب سے بہت آگے ہے اور اخروی کامیابی میں یہی چیز زیادہ اہم ہے۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں مشرق اور مغرب کی ترقی کے اپنے اپنے معیار ہیں۔ مشرق روحانیت کا دلدادہ، جبکہ مغرب مادیت کا متلاشی ہے اور دونوں اپنے اپنے شعبوں میں کمال مہارت رکھتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ تصدق حسین رضوی، سید، لغات کشوری، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۵۲ء، ص ۱۱۱

۲۔ علی عزت بیگوچ، اسلام اور مشرق و مغرب کی تہذیبی کشمکش، مترجمہ محمد ایوب منیرہ، ادراہ معارف اسلامی، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۹۴

۳۔ ارشد محمود، ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ، علمی گرافکس، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص ۳۸

۴۔ بانو قدسیہ، حاصل گھاٹ، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء ص ۱۷۴

۵۔ ایضاً، ص ۱۹۴

۶۔ ایضاً، ص ۵

۷۔ ایضاً، ص ۳۲۴

۸۔ ایضاً، ص ۴۵

۹۔ علی عزت بیگوچ، اسلام اور مشرق و مغرب کی تہذیبی کشمکش، مترجمہ محمد ایوب منیرہ، ص ۱۱۴۔۱۱۵

۱۰۔ خالد علوی، ڈاکٹر، تعلیم اور جدید تہذیبی چیلنج، دعوۃ اکیڈمی، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، ص ۲۹

۱۱۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص ۱۳۶۔۱۳۷

۱۲۔ ابو الاعجاز، حفیظ صدیقی (مرتب)، کشافِ تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۱۳۶

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۳۶

۱۴۔ محمد طاہر عباسی، خواجہ، تصوف کیا ہے، بتاریخ ۱۰ جولائی ۲۰۲۰، بوقت ۱۰ بجے صبح

https://www.facebook.com/notes/tasawwuf/

۱۵۔ عطش درانی، اسلامی فکر و ثقافت، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۱۱۷

۱۶۔ ابدال بیلا، ڈاکٹر، دروازہ کھلتا ہے، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۱۹۴

۱۷۔ بانو قدسیہ، حاصل گھاٹ، ص، ۱۳۰

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۹۰

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۲۰

۲۰۔ ایضاً، ص ۲۲۰

۲۱۔ ایضاً، ص ۲۷

۲۲۔ ایضاً، ص ۴۴

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۷
۲۴۔ ایضاً، ص ۸۳
۲۵۔ ایضاً، ص ۱۲۲
۲۶۔ ایضاً، ص ۲۴۰
۲۷۔ ایضاً، ص ۲۳۹
۲۸۔ ایضاً، ص ۲۵۶
۲۹۔ ایضاً، ص ۲۱۸
۳۰۔ فیروز الدین، مولوی، فیروز اللغات، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۵۲ء، ص ۶۹۲
۳۱۔ ابوالاِعجاز، حفیظ صدیقی (مرتب)، کشافِ تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۵۸ء، ص ۱۱۶
۳۲۔ طارق محمود مغل، معاشرتی نفسیات، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۲۵
۳۳۔ ابوالاِعجاز، حفیظ صدیقی (مرتب)، کشافِ تنقیدی اصطلاحات، ص ۲۷۰
۳۴۔ بانو قدسیہ، حاصل گھاٹ، ص ۸۹
۳۵۔ ایضاً، ص ۲۳۷
۳۶۔ ایضاً، ص ۵۴
۳۷۔ ایضاً، ص ۲۱۱
۳۸۔ ایضاً، ص ۳۷
۳۹۔ ایضاً، ص ۵۲
۴۰۔ ایضاً، ص ۲۲۳
۴۱۔ ایضاً، ص ۲۹۹
۴۲۔ ایضاً، ص ۱۵۸
۴۳۔ ایضاً، ص ۱۳۴
۴۴۔ ایضاً، ص ۱۴۸
۴۵۔ ایضاً، ص ۲۹۱
۴۶۔ ایضاً، ص ۲۱۶
۴۷۔ ایضاً، ص ۹۵

۴۸۔ ایضاً، ص۹۳

۴۹۔ ایضاً، ص۲۱۵

۵۰۔ ایضاً، ص۳۰۰

۵۱۔ ایضاً، ص۳۲۵۔۳۲۶

باب پنجم

مجموعی جائزہ / نتائج / سفارشات

الف۔ مجموعی جائزہ:

ناول انگریزی صنفِ ادب ہے۔ اٹھارہویں صدی میں اس صنف نے انگلستان میں جنم لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اتنی مقبول ہوئی کہ پورے یورپ اور پھر ساری دنیا پر چھا گئی۔ ناول کے معنی عجیب اور انوکھی شے کے ہیں۔ جب یہ صنف معرضِ وجود میں آئی تو بالکل نئی تھی اس لئے اس کے نئے پن کی وجہ سے اسے ناول کا نام دیا گیا۔ یہ صنف اردو میں انگریزی کے توسط سے آئی ہے۔

ناول اس نثری قصے کو کہتے ہیں جس میں کسی خاص نقطہ نظر کے تحت زندگی کی حقیقی اور واقعاتی عکاسی کی گئی ہو۔ ناول کا مرکزی کردار اس کا ہیرو ہوتا ہے اور ہم اسی کے توسط سے کائنات کی حقیقتوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس میں حیاتِ مستعار کے کئی روپ پیش کئے جاتے ہیں اور واقعات میں ایک منطقی تسلسل ہوتا ہے۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ناول وہ کہانی ہے جس کی بنیاد حقیقی زندگی پر ہوتی ہے۔ اس میں سماجی اور معاشرتی زندگی کے حقائق کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ یہ حقائق اور قصے کرداروں کے ذریعے بیان کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا حقیقت نگاری اور صداقت بیانی اس کا خاصہ ہے۔

اردو ناول نگاری کی روش پر بانو قدسیہ ایک ایسے پھول کی مانند ہیں جس کی مہک نہ صرف قارئین و ناظرین بلکہ ناول نگاروں کو بھی مسحور کرتی ہے۔ بانو قدسیہ کا اپنا ایک خاص انداز ہے جو کسی بھی طرح ان کے ہم عصروں کے اندازِ بیاں سے مماثل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بانو قدسیہ اردو نثر میں اپنے حسن و جمال، دلکش، دل فریب اور ناصحانہ اندازِ تحریر کی بدولت ایک بلند مقام رکھتی ہیں۔ خصوصاً ناول کے میدان میں جہاں انہوں نے ''راجہ گدھ'' لکھ کر شہرت حاصل کی وہیں انہوں نے ادب کو ''حاصل گھاٹ'' جیسی تخلیق دولت سے بھی مالا مال کیا جو مصنفہ کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

''حاصل گھاٹ''۲۰۰۳ء میں سنگِ میل پبلشرز نے شائع کیا تھا۔ اس کتاب کے کل صفحات ۳۳۶ ہیں۔ یہ ناول ہجرت کے پسِ منظر میں لکھا گیا ہے۔ کیونکہ اردو ادب میں ہجرت کا موضوع ایک خاص اہمیت

رکھتا ہے۔اس لئے ''حاصل گھاٹ'' کا بنیادی موضوع بھی ہجرت کے تجربہ پر مبنی ہے جس میں ہمایوں اور اس کے خاندان کی ہجرت کی کہانی پیش کی گئی ہے۔

میں نے اپنے تحقیقی مقالے کے باب اول میں ''ثقافتی شناختوں اور بنیادی مباحث'' کے حوالے سے بحث کی ہے۔ جس میں سب سے پہلے ثقافت کے معانی و مفاہیم پر روشنی ڈالتے ہوئے ثقافت کی سادہ اور آسان تعریف کچھ یوں بیان کی ہے کہ تہذیب و ثقافت سے مراد لوگوں کا رہن سہن اور طرزِ زندگی ہے جس میں ان کے رسم و رواج اور اقدار و روایات سبھی شامل ہوتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ ثقافت ایک کل کی حیثیت رکھتی ہے اور کسی علاقے میں رہنے والے انسانوں کے ارادی و غیر ارادی افعال کی بدولت پروان چڑھتی ہے اور یوں ان کے عقائد، رسم و رواج، علوم و فنون، قوانین اور معاشرتی رویے اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ لفظ ثقافت کے حوالے سے مختلف محققین مختلف نظریہ رکھتے ہیں۔ جن میں کچھ ثقافت کو کلچر کے معنوں میں تو کچھ تہذیب و تمدن کے ہم معنی قرار دیتے ہیں۔ جبکہ ''ثقافت کے عناصرِ ترکیبی'' میں بھی مختلف محققین کے ہاں اختلاف نظر آتا ہے۔ لیکن بحثیتِ مجموعی فنونِ لطیفہ، مذہبی شعائر یا رسوم، اخلاقی ضابطے اور اقدار، عقائد، رویے، خاندانی اور معاشرتی نظامِ حکومت وغیرہ ثقافت کے بنیادی عناصر میں شمار ہوتے ہیں۔ اسی طرح ''معاشرے اور زبان کی تشکیل میں ثقافت کے کردار'' کے حوالے سے بھی بات کی گئی ہے کہ معاشرے کا وجود انسانوں کے باہم مل کر رہنے اور باہم اختلاط کے ساتھ ساتھ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اور انہی کے باہم مل کر رہنے سے ثقافت کی داغ بیل ڈالتی ہے جو نسلاً بعد نسلاً آگے بڑھتی، ترقی کرتی اور نشوونما پاتی ہے۔ ان عوامل کو باہم جوڑنے اور درست ترسیل کے لئے زبان ایک کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ گویا یوں زبان اور ثقافت باہم یکجا ہو جاتے ہیں۔ نیز انسانی زندگی میں جہاں ثقافت کا عمل دخل ہوتا ہے وہیں زبان بھی اسی کے ساتھ ساتھ شامل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ''ثقافتی تنوع'' کے حوالے سے بھی ایک سرسری سا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں بانو قدسیہ کی نجی زندگی کا مختصر سا تعارف اور ادبی خدمات کا جائزہ بھی باب اول میں شامل ہے۔

ایک عمدہ فن پارے کی یہ بھی خوبی ہوتی ہے کہ وہ جس عہد میں تخلیق کیا جاتا ہے، اُس کی اقدار و روایات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ اسی لئے کوئی بھی عمدہ فن پارہ اپنے عہد و معاشرت کی روایات، اقدار کا نہایت خوبصورت عکاس ہوتا ہے۔ اسی تناظر میں میرا دوسرا باب ''حاصل گھاٹ میں پاکستانی اور امریکی ثقافت کی سماجی شناختوں'' پر مبنی ہے ۔ جس کو آگے مزید چار ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے

جز 'الف' میں " عالمگیریت کا سماجی اور معاشی تناظر " کے حوالے سے روشنی ڈالتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ عالمگیریت ہے کیا؟ کیونکہ اس باب کی خاص بات ہی عالمگیریت پر بحث ہے، جس میں آج کا معاشرہ گرفتار نظر آتا ہے۔ عالمگیریت درحقیقت ایک ایسا نیا نظام ہے جس میں معاشرے کو معیشت کے زیر اثر لایا جارہا ہے۔ یوں معیشت بنیادی اکائی ٹھہرتی ہے جس کو وسعت دینا مقصود ہے، اس وجہ سے ثقافت، معاشرہ، مذہب، اخلاق سب عالمگیریت سے متاثر ہو رہے ہیں۔ چونکہ عالمگیریت سے سماج، معاشرہ، اخلاق، مذہب، عائلی و خاندانی زندگی، تصور حیات، سب متاثر ہو رہا ہے۔ اسی لئے عالمگیریت کے بنیادوں معنوں کے علاوہ سماجی حوالے سے بھی عالمگیریت کو پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور پھر 'حاصل گھاٹ میں سماجی عالمگیریت اور معاشی تناظر' کے تحت عالمگیریت کے زیرِ اثر سماجی اور معاشی غلبے کی وجہ سے جو اثرات مرتب ہوئے ہیں ان سب کا احوال پیش کیا گیا ہے۔

اسی طرح جز 'ب' میں "اخلاقی جہات اور مذہبی تناظر" کے حوالے سے مشرق اور مغرب کے درمیان جو مذہبی اور اخلاقی حالتیں پیش کی گئی ہیں ان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پس ان سب کو مد نظر رکھتے ہوئے مصنفہ اس نتیجہ پر پہنچتی ہیں کہ دونوں کی اقدار، مذہب، اخلاقیات، رسم ورواج سب ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ کیونکہ مغرب ایک نظام کے تابع ہے اور اسی نظام کی اتباع کی وجہ سے اس میں بعض اخلاقیات کا پیمانہ ہم سے بہت اچھا ہے لیکن دوسری طرف مشرق کے نزدیک مذہب ہی ہماری نجات یعنی فلاح کا ذریعہ ہے۔

جبکہ جز 'ج' میں " عائلی زندگی اور خاندانی تناظر" کے حوالے بات کی گئی ہے۔ جس میں مصنفہ نے دو مختلف تہذیبوں یعنی مشرقی اور مغربی تہذیب و ثقافت کے اثرات و اقدار کا اظہار اور ان سے منسلک ماحول کی عکاسی کی ہے۔ اور ثابت کیا ہے کہ جس طرح مشرق اور مغرب سمت کے لحاظ سے ایک نہیں ہوسکتے اسی طرح مغربی معاشرہ اور مشرقی معاشرہ خاندانی اور سماجی تناظر کے حوالے سے کبھی بھی ایک نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ دونوں کے خاندانی طرزِ بود و باش میں زمین آسماں کا فرق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق شروع سے ہی سراپہ محبت والفت پر مبنی ہے جبکہ مغرب سراسر شخصی آزادی کا دلدادہ ہے۔

جز 'د' میں "قدیم وجدید تصورِ حیات کی کشمکش" کے مد نظر بانو قدسیہ نے مشرقی اور مغربی معاشرے کے لوگوں کی عادات، رویے، خیالات، جذبات، اور قدیم و جدید طرزِ بود و باش کا تقابل بہت خوبصورتی سے

پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ مصنفہ نے جدیدیت کے زیرِ اثر موجودہ معاشرے کی سماجی الجھنوں، اخلاقی گمراہیو ں اور پیچیدہ معاشرتی اور عصری رویوں کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ''حاصل گھاٹ'' کی معاشرہ نگاری اور فضاء بندی میں کافی گہرائی دکھائی دیتی ہے۔

پس 'باب دوم' میں جو چار ذیلی جزو بیان کئے گئے ہیں ان سب سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ''حاصل گھاٹ'' میں بانو قدسیہ کسی ایک پہلو کو لے کر صرف اس کی عکاسی کر کے اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہوتیں بلکہ وہ زندگی کے ہر رُخ خواہ وہ روشن ہو یا تاریک ناظرین کے سامنے پیش کر کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالنا اپنا فرض سمجھتی ہیں۔ اس لئے ''حاصل گھاٹ'' میں جو کہانی پیش کی گئی ہے اور جس طرح مصنفہ نے ناول کا تانا بانا بنا ہے اس میں فرد کی فکری، جذباتی اور احساساتی دنیا نیز اس کی داخلی کشمکش، انتشار کرب، بددلی اور مشینی ماحول کی پیدا کردہ زندگی کی بے معنویت، یکسانیت، تنہائی اور بے چارگی کا احساس نمایاں ہے۔ نیز ان سب کے پسِ پردہ موجودہ معاشرے میں عالمگیریت کے زیرِ اثر مذہبی، اخلاقی، معاشرتی انحطاط اور اس کے پسِ منظر میں سر اٹھانے والی برائیوں سے جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں، ان سب کو اس باب میں تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ناول کی تخلیق میں مصنفہ کی برسوں کی محنت شامل ہے۔

ہر ادیب چونکہ اپنے عہد کا نباض ہوتا ہے۔ اس لئے اُس کی تخلیقات میں اس کے عہد کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ اور وہ اپنے ہمعصروں اور اپنے عہد تک محدود نہیں رہتا یعنی اس کی تخلیقات صرف اس کے عہد تک بامعنی ثابت نہیں ہوتیں بلکہ وہ آنے والے زمانے میں اور ہمیشہ بامعنی ثابت ہوتی ہیں۔ اور یہ وصف بانو قدسیہ اور اس کی تخلیق یعنی اس ناول '' حاصل گھاٹ'' میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اسی حوالے سے میرا تیسرا باب ''حاصل گھاٹ میں پاکستانی اور امریکی ثقافت کی سیاسی شناختوں'' پر مبنی ہے۔ اس باب میں بھی تین ذیلی عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلے اس باب کے جز 'الف' میں ''سیاست کے پاکستانی و امریکی امتیازات'' کو نشان زدہ کیا گیا ہے۔ پاکستانی اور امریکی سیاست کے امتیازات کو بیان کرنے کے بعد ''سیاسی عالمگیریت کے عام آدمی کی زندگی پر اثرات'' کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔

ان سب باتوں کا احاطہ کر لینے کے بعد جز 'ج' میں ''حاصل گھاٹ میں سیاسی عالمگیریت کی عکاسی'' کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کیونکہ بانو قدسیہ نے ''حاصل گھاٹ'' میں نہ صرف اپنے دور کی سیاسی افراتفری اور فسادات سمیت عصری مسائل و رجحانات کی بھرپور ترجمانی کی بلکہ عالمی سطح پر رونما ہونے

والے واقعات و اثرات کو بھی بڑے خوبصورت اور وسیع انداز میں پیش کیا ہے۔ خصوصاً نائن الیون کے واقعے کے بعد بین الاقوامی سیاست اور عالمی ماحول یکسر تبدیل ہو گیا۔ اگر چہ یہ سانحہ پاکستان سے کوسوں دور رونما ہو الیکن اس کے براہ راست اثرات پاکستان کو بھی سہنے پڑے۔ لہذا اس حادثے کی انتقامی کاروائیوں نے پاکستان کی سیاست، معیشت اور خارجہ پالیسی کو جس طرح متاثر ہوئی اس سب کا احوال اس جزو میں تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

پس باب سوئم میں تین ذیلی عنوانات کے تحت بتایا گیا ہے کہ بانو قدسیہ کے ناول ''حاصل گھاٹ'' میں نہ صرف ان کے عہد اور اس عہد کے مسائل کا عکس نمایاں ہے بلکہ گزرے ہوئے زمانے کے عالمی اور قومی سطح پر رونما ہونے والے سیاسی واقعات و حوادث کا بیان بھی ان کے ناول میں موجود ہے۔ ناول نگار چونکہ گہرا سیاسی شعور و ادراک رکھتی ہیں اس لئے انہوں نے بڑی فنی چابکدستی سے ناول میں تقسیمِ ہند کا المناک حادثہ، انتقالِ آبادی سے پیدا ہونے والے مسائل، پاکستان کا قیام عمل میں آنے کے بعد بد انتظامی، افراتفری سے متعلق واردات اور حالات کے موثر خاکے ہمارے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ الغرض سیاسی تناظر میں قیامِ پاکستان سے لے کر سقوطِ ڈھاکہ تک، جہاد افغانستان سے لے کر روس کے زوال تک، نیو ورلڈ آرڈر سے لے کر کشمیر، بوسنیا، فلسطین، افغانستان اور عراق میں ڈھائے جانے والے مظالم تک، کوئی بھی ایسا واقعہ یا حادثہ نہیں جس کا عکس ''حاصل گھاٹ'' میں دکھائی نہ دیتا ہو۔

اسی طرح مقالے کا چوتھا باب ''حاصل گھاٹ میں پاکستانی اور امریکی ثقافت کی علمی شناختوں'' کے حوالے سے ہے۔ اس باب میں بھی تین ذیلی عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔ چونکہ یہ باب بھی متنوع موضوعات کا احاطہ کرتا ہے اس لئے سب سے پہلے جز 'الف' میں ''سائنسی ایجادات اور ٹیکنالوجی کی بدولت تمدنی فرق و امتیاز'' کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اور 'معاصر زندگی کی تمدنی تبدیلیاں' کے حوالے سے جائزہ لیا گیا ہے۔ جس میں تمدن کی بحث قابل ذکر ہے۔ اس ضمن میں تمدن کی تعریف کو سمجھنے کے بعد مشرق اور مغرب میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی بدولت تمدنی فرق و امتیاز کو زیر بحث لایا گیا ہے اور 'حاصل گھاٹ میں تمدنی امتیازات' میں اس کی عکاسی کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

چونکہ یہ باب علمی شناختوں کے حوالے سے ہے اس لئے اس باب کے جز 'ب' میں ''فلسفیانہ وصوفیانہ امتیازات'' کو اجاگر کرنے کے لئے فلسفہ اور صوفی ازم پر بھی بات کی گئی ہے۔ جبکہ 'حاصل گھاٹ میں فلسفیانہ

اور صوفیانہ امتیازات' کے تحت مغربی اور مشرقی معاشرے کے درمیان تقابل پیش کیا گیا ہے۔ بانو قدسیہ کو تصوف سے ایک خاص دلچسپی اور مناسبت تھی اسی لئے مصنفہ نے ناول میں انسان کی تخلیق، اس کے ذہنی و فکری ارتقاء، اس کی نفسیات، اس کی تہذیب و مذہب اور تصوف کے حوالے سے کائنات میں اس کے مقام کی بحث کی ہے اور پھر ان تمام مباحث کا سرا فکری لحاظ سے تصوف اور روحانیت سے جوڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ناول میں فلسفہ حیات اور تصوف کے ملاپ سے ناظرین کو اخلاقی درس دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ناول میں بارہا ایسے مقامات آتے ہیں اور بہت سی ایسی سطور بھی دیکھنے کو ملی ہیں جن میں وہ آگہی اور شعور بھی ہے، جو تفکر و تعقل کے ہزار ہا دریچے وا کرتا ہے اور قوموں میں بصیریت اور بیداری مغزی کے چراغ روشن کرتا ہے۔ مصنفہ چونکہ زیادہ تر مذہب اور تصوف کے گرد گھومتی ہیں اس لئے ناول کے پس منظر میں تصوف کا دریا پورے زور و شور سے بہتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

باب چہارم کے 'ج' جز میں " ذہنی و نفسیاتی سطحوں میں فرق و امتیاز" کو مد نظر رکھتے ہوئے سب سے پہلے ' ذہن اور نفسیات کی تعارفی بحث' کو پیش کیا گیا ہے۔ اور پھر اسی تناظر میں 'حاصل گھاٹ میں کرداروں کی ذہنی و نفسیاتی شناختیں' کے حوالے سے ان کی ذہنی سوچ اور فکر کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ جبکہ ذہنی اور نفسیاتی حوالے سے کرداروں کے مابین فرق کو بھی سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نیز بانو قدسیہ نے کردار نگاری کرتے ہوئے ہر کردار کی فطرت اور حیثیت کا خاص خیال رکھا ہے۔ کرداروں کے عمل سے ان کی فطرت، حیثیت اور اہلیت اس طرح ظاہر کی ہے جس میں انسانی جذبات و نفسیات اور احساسات کی ہلچل اور گہما گہمی محسوس کی جا سکتی ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی لگتا ہے بانو قدسیہ نے ہر کردار کے دماغ میں جھانک کر دیکھا ہے۔ اس طرح جو بھی کیفیت نظر آئی ہے اس کا بیان اس باب میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ب۔ نتائج:

تحقیقی موضوع "حاصل گھاٹ میں پاکستانی اور امریکی معاشرے کی ثقافتی شناختیں (تجزیاتی مطالعہ)" پر کام کرنے سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔

بانو قدسیہ کے ناول " حاصل گھاٹ " کی کہانی در حقیقت ہجرت کے تجزیہ پر مبنی ہے۔ بانو قدسیہ کے نزدیک ہجرت صرف اپنے مولد سے بچھڑنے کا نام ہی نہیں بلکہ یہ تہذیب و ثقافت کو کھو دینے کا المیہ بھی ہے۔ چنانچہ مصنفہ کے نزدیک مادی ترقی کے حصول کی خاطر کی جانے والی ہجرت کبھی بھی انسان کو ذہنی و روحانی

سکون اور اطمینانِ قلب سے آشنا نہیں کر سکتی۔ یوں اس ناول کا بنیادی موضوع مادیت پرست معاشرے میں انسان کی تنہائی بھی ہے۔

ثقافتی تناظرات کے حوالے سے ناول ''حاصل گھاٹ'' ہجرت اور کرب کہ کہانی پر مبنی ہے۔ ناول کی بنیاد چونکہ پاکستانی اور امریکی معاشرے کی ثقافت پر مبنی ہے اس لئے اس کی نہایت عمدہ عکاسی ناول کی کہانی میں نظر آتی ہے۔ پاکستان کی ثقافت میں مذہب، اسلامی اقدار، اخلاقیات، لباس، حلال اور حرام میں تمیز، بڑوں کا ادب، اجتماعی خاندانی نظام وغیرہ چند نمایاں خدوخال ہیں جبکہ امریکی ثقافت کے کلیدی پہلو آزاد خیالی، شخصی آزادی، محدود خاندانی نظام، وقت کی پابندی، صفائی ستھرائی، قانون کی پاسداری اور ذاتی عزت و مرتبت ہے۔

''حاصل گھاٹ'' میں بانو قدسیہ نے دو بڑی تہذیبوں یعنی مشرق اور مغرب کے درمیان فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں تہذیبیں ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں اس لئے ان دونوں تہذیبوں کے درمیان نقطہ توازن تلاش کرنا بہت دشوار ہے۔ لیکن بانو قدسیہ نے ان دونوں تہذیبوں میں سے کسی ایک کی طرف داری کی بجائے معروضی نقطہِ نظر سے دونوں تہذیبوں کے حسن و قبح پر روشنی ڈالی ہے۔ مگر مصنفہ چونکہ مذہب سے ایک خاص شغف اور مناسبت رکھتی ہیں اس لئے مذہب کی پیروی میں وہ امریکی ثقافت پر نکتہ چینی کرتی نظر آتی ہیں۔ مذہبی سوچ کے زیرِ اثر وہ مشرقی ثقافت کو فوقیت دیتی ہیں یوں ان میں جانبداری کا عنصر بھی دَر آتا ہے۔ الغرض مذہب کی جزو کو چھوڑ کر مصنفہ نے سارے ناول میں حقائق کا بیان نہایت غیر جانب داری اور بغیر کسی تعصب کے کیا ہے۔

'' حاصل گھاٹ'' میں ہر دو ثقافتوں کے بنیادی امتیازات اور اختلافات ایک خاص معنوی تناظر کے حامل ہیں، یعنی مذہبی تناظر۔ پاکستان کی کل ثقافت مذہب کی پیروی میں تشکیل پاتی ہے اور ہر وہ عمل یا ثقافتی پہلو جو مذہب سے متصادم ہو، ثقافتی حوالے سے ترک کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بالمقابل مغرب سیکولر اقدار کا علمبردار ہے۔ وہاں ثقافت ایک بڑی اکائی ہے جس میں مذہب بحیثیت ایک چھوٹی اکائی کے شامل ہے لیکن حکومت کا مذہب سے کوئی سروکار نہیں۔ پس یہی وہ خاص معنوی تناظر ہیں جس کی ذیل میں پورا ناول تشکیل پاتا نظر آتا ہے۔

ج۔ سفارشات:

۱۔ بانو قدسیہ کو مذہب اور بالخصوص تصوف سے ایک خاص انسیت تھی۔اس حوالے سے ان کے ناول اور افسانوں پر مزید کام کی گنجائش موجود ہے۔

۲۔ بانو قدسیہ نے ناول "حاصل گھاٹ" میں ہجرت کو ایک بالکل نئے رنگ میں دکھانے کی کوشش کی ہے اور ہجرت کی بہت سی اقسام کا خود ذکر بھی کیا ہے۔اس حوالے سے بھی ان کے کام کو مزید آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

۳۔ بانو قدسیہ کے ثقافتی حوالے بہت متاثر کن صورت حال کے حامل ہیں،ان کی نظر ثقافت کی ایک ایک اکائی پر نہایت خوبصورتی سے پڑتی ہے۔اس حوالے سے بانو قدسیہ کے مزید ناولوں اور افسانوں پر بھی کام کرنے کی گنجائش موجود ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ

بانو قدسیہ، حاصل گھاٹ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء

ثانوی ماخذات

ابو الاِعجاز، حفیظ صدیقی (مرتب)، کشافِ تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۵۸ء

ایس ایم شاہد، اسلام اور جدید سیاسی وعمرانی افکار، ایورنیو بک پیلس، لاہور، س۔ن

ابدال بیلا، ڈاکٹر، دروازہ کھلتا ہے، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء

اصغر عبد اللہ، بانو قدسیہ کا حیات و فن، (انٹرویو) مشمولہ: بانو قدسیہ: شخصیت اور فن، مرتبہ انور سدید، ڈاکٹر، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

ارشد محمود، ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ، علمی گرافکس، کراچی، ۲۰۰۹ء

اقبال آفاقی، ڈاکٹر، مابعد جدیدیت: فلسفہ و تاریخ کے تناظر میں، مثال پبلیشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۳ء

انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء

باقر مہدی، نئ تعلیم کے مسائل، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئ دھلی، ۲۰۱۱ء

تصدق حسین رضوی، سید، لغات کشوری، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۵۲ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

خورشید احمد، پروفیسر، امریکہ، مسلم دنیا کی بے اطمینانی (۱۱ ستمبر سے پہلے اور بعد)، انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء

خالد علوی، ڈاکٹر، تعلیم اور جدید تہذیبی چیلنج، دعوۃ اکیڈمی، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء

خالد علوی، ڈاکٹر، اسلام اور عالمگیریت، دعوۃ اکیڈمی، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء

روتھ بنی ڈکٹ، ڈاکٹر، نقوش ثقافت، (مترجمہ) سید قاسم محمود، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء

سید عبد اللہ، ڈاکٹر، کلچر کا مسئلہ، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۷ء

سجاد نقوی، پاکستانی ثقافت کی شناخت، (مضمون) مشمولہ: پاکستانی ادب، مرتبہ رشید امجد/فاروق علی، فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج، راولپنڈی، ۱۹۸۱ء

سلیم اختر، ڈاکٹر، ادب اور کلچر، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء

سیموئیل ہنگٹن، امریکی مفادات اور امن، (مضمون) مشمولہ: گلوبلائزیشن اور اسلام از یاسر ندیم، دارالاشاعت، کراچی، ۲۰۰۴ء

سلمان عابد، پاکستان میں جمہوریت کے تضادات، جمہوری پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء

سیموئیل پی ہنٹنگٹن، تہذیبوں کا تصادم، مترجمہ محمد احسن بٹ، نگارشات، لاہور، ۲۰۱۹ء

شیخ عبدالرزاق، گلوبلائزیشن اور عالم اسلام، مکتبۃ الفہیم، یوپی، ۲۰۱۴ء

حیات صفدر، آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان ۱۹۷۳ء، نیو بک پیلس، لاہور، ۱۹۸۱ء

طارق محمود مغل، معاشرتی نفسیات، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۷ء

عطش درانی، اسلامی فکر و ثقافت، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۷ء

عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر، پاکستانی ثقافت، (مضمون) مشمولہ: پاکستانی ثقافت، مرتبہ رشید امجد، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۹ء

عثمان فاروق، ڈاکٹر، اردو ناول میں مسلم ثقافت، بیکن ہاوس، لاہور، ۲۰۰۲ء

علی عزت بیگوچ، اسلام اور مشرق و مغرب کی تہذیبی کشمکش، مترجمہ محمد ایوب منیرہ، ادراہ معارف اسلامی، لاہور، ۲۰۰۴ء

فرینکلن ایشر، تاریخ امریکہ، مترجمہ احسن صدیقی / احسن حامد، حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۵۷ء کلیم اللہ، سماج کا ارتقا، سنگم پبلیشرز لمیٹیڈ، لاہور، س۔ن

لال خان، ڈاکٹر، تناظر ۲۰۰۰ء سوشلسٹ انقلاب اور پاکستان، طبقاتی جدوجہد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء

ممتاز مفتی، بانو قدسیہ: پتی بھگت، (مضمون) مشمولہ: اور اوکھے لوگ، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۹۱ء

مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، ثقافتی بشریات، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء

مقصود جعفری، ڈاکٹر، چراغِ افکار، ایس ٹی پرنٹرز گوالمنڈی، راولپنڈی، ۲۰۰۸ء

محمد نعیم ورک، اردو ناول کا ثقافتی مطالعہ (۱۸۶۹ تا ۱۹۴۷)، کتاب محل، لاہور، ۲۰۱۹ء

نظیر صدیقی، تفہیم و تعبیر، کارواں ادب، ملتان، ۱۹۸۳ء

نصیر احمد، ناصر، ڈاکٹر، اسلامی ثقافت، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۸۴ء

ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، لسانیات اور تنقید، پورب اکیڈمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء

وزیر آغا، ڈاکٹر، کلچر اور پاکستانی کلچر،(مضمون)مشمولہ: پاکستانی ثقافت، مرتبہ رشید امجد، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد،۱۹۹۹ء

وہاب اشرفی، مابعد جدیدیت: مضمرات وممکنات، کتاب محل، الہ آباد،۲۰۰۲ء

Oxford Advanced Learners Dictionary, Oxford University Press, 2010

Oxford Advanced Learners Dictionary, Oxford University Press, 1986 Peltason, JD,

About America (The constitution of the United States of

America with explanatory notes) U.S Department of State,Washington, 2004,

Patricia Bradley, Making American Culture, Palgrave Macmillan,New

York,2009, pg10

رسائل وجرائد

ایم خالد فیاض، کلچر اور سویلزیشن کے اردو متبادلات ومفاہیم، مشمولہ: دریافت، شمارہ۵، ۲۰۱۰ء، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء

ثروت جمال اصمعی، مغرب اور اسلام،(مضمون) مطبوعہ: عورت مغرب اور اسلام، جلد ۱۵، شمارہ۱، ۲۰۱۲ء، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، س۔ن

مظہر عباس، ڈاکٹر / لیاقت علی، ڈاکٹر، عالمگیریت: سماجی تناظر اور اردو ناول، (مضمون)مشمولہ: تحقیق نامہ، شمارہ ۲۵، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۹ء

انٹرنیٹ

روزنامہ نوائے وقت، ایڈیٹر رمیزہ مجید نظامی، ثقافتی تنوع برائے فروغ مکالمہ وترقی کا عالمی دن، بتاریخ ۸ نومبر ۲۰۱۹، بوقت ۹ بجے صبح https://www.nawaiwaqt.com.pk/22-May-2017/607374

غلام شبیر، ڈاکٹر، (مضمون) بانو قدسیہ: کس سمت لے گئیں مجھے اس دل کی دھڑکنیں، بتاریخ ۵ اکتوبر ۲۰۱۹ء، بوقت ۱۲ بجے دوپہر http://www.urdulinks.com/urj/?p=1463

ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، عالمگیریت اور ثقافت (مضمون)، خیال نامہ

https://khayyalnama.com/tanqeed/

ملیحہ لودھی، ڈاکٹر، جغرافیائی سیاست کی واپسی، العربیہ اردو، بتاریخ ۱۰ مئی ۲۰۲۰ء، بوقت ۷ بجے شام

http://urdu.alarabiya.net/ur/politics/2014/11/27/

محمد طاہر عباسی، خواجہ، تصوف کیا ہے، بتاریخ ۱۰ جولائی ۲۰۲۰، بوقت ۱۰ بجے صبح

https://www.facebook.com/notes/tasawwuf/

لغات/فرہنگ

تصدق حسین رضوی، سید، لغات کشوری، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۵۲ء

سید احمد دہلوی، فرہنگِ آصفیہ، جلد سوم، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۶ء

سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی اصطلاحات (توضیحی لغت)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء

فیروز الدین، مولوی، فیروز اللغات، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۵۲ء

لوئیس معلوف، المنجد فی اللغۃ، المکتبہ الشرقیہ بیروت، لبنان، ۱۹۹۶ء

نور الحسن منیر کاکوروی، مولوی، نور اللغات (جلد سوم)، جنرل پبلشنگ ہاؤس، کراچی، س۔ن